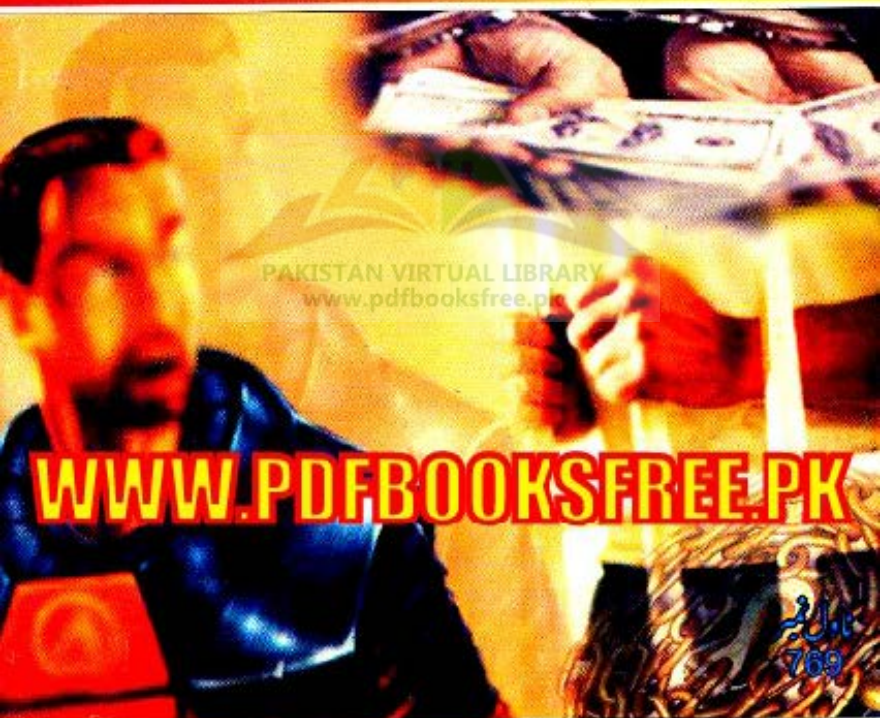


جولائی
2010

Courtesy of www.pdfbooksfree.pk

انسپکٹر جمشید پارٹی، انسپکٹر کامران مرزا پارٹی اور شوکی برادرز

زاران کی زنجیر



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

WWW.PDFBOOKSFREE.PK

نمبر
769



Atlantis
Publications

اشتقاق احمد

ایک حدیث

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کی رضا کے لیے خرچ کرو گے، اس پر تمہیں ضرور اجر دیا جائے گا حتیٰ کہ اس (حقے پر بھی) جو تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالو گے۔
(بخاری، مسلم)

☆☆☆

ناول پڑھنے سے پہلے یہ دیکھ لیں کہ:

- ☆ بیعت عہدت کا تو نہیں۔
- ☆ آپ کو اسکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔
- ☆ آپ نے کسی کو وقت تو دے نہیں رکھا۔
- ☆ آپ کے ذمے گمراہوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔
- ☆ اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بات بھی ہو تو ناول نگاری میں مدد کریں، پہلے عہدت اور دوسرے کاموں سے فارغ ہو لیں، پھر ناول پڑھیں۔

اشتیاق احمد

Atlantis
Publications

تفریح بھی، تربیت بھی

اتلانٹس پبلکیشنز محنت سے ماہر لکھنے والے پکڑنے والوں کی کم قیمت ملاحات کے ذریعے ہر عمر کے لوگوں میں مطالعے اور کتب بینی کے فروغ کیلئے کوشاں ہے۔

ناول زمان کی زنجیر
نمبر انیکلر جیشیر بر نمبر 769
پبلشر طارق احمد
قیمت 240 روپے

جملہ حقوق محفوظ ہیں

اتلانٹس پبلکیشنز کی جنگی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل، کسی قسم کی ذخیرہ کاری جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکا ہو یا کسی بھی شکل میں اور کسی بھی ذریعے سے ترسیل نہیں کی جاسکتی۔ یہ کتاب اس شرط کے تحت فروخت کی گئی ہے کہ اس کو بغیر بائزر کی جنگی اجازت کے طور تجارت یا بصورت دیگر مستعار دوبارہ فروخت نہیں کیا جائے گا۔

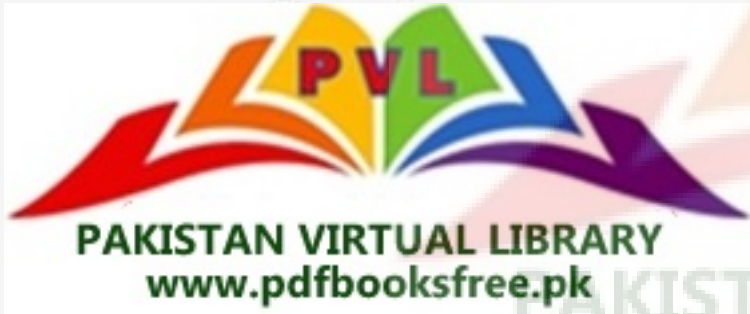
ناول حاصل کرنے اور ہر قسم کی غلط کتب اور رابطے کیلئے معذرتیں پیش کر رہے ہیں۔

A-36 برائین سٹریٹ، پورہ B-15، لاہور
0300-2472238 32578273 34228030
e-mail: atlantis@cyber.net.pk
www.inspector-umshad-series.com

اتلانٹس
پبلکیشنز

لے دے کر اسی کے بارے میں بات کی جاسکتی ہے... بات کسی اور طرف نکل گئی تو ایسا نہیں ہو سکے گا... اور زاران کی زنجیر تک محدود رکھی گئیں تو آپ خود کو ان کا قیدی محسوس کریں گے... اب اس جھنجٹ سے بچنے کا طریقہ صرف اور صرف یہ رہ جاتا ہے کہ دو باتیں کا یہ صفحہ جوں کا توں چھوڑ دیا جائے اور آپ سے اجازت لے لی جائے... لہذا اجازت!

منشی



دو باتیں

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ! یہ زاران کی زنجیر کی دو باتیں ہیں، گویا اس ناول میں آپ زاران کی زنجیر سے ملیں گے۔ یوں تو زنجیر بھی بڑی ہوتی ہے... لیکن زاران کی زنجیر کی گرفت اور زیادہ بڑی ہوتی ہے۔

ناول ذرا اور ہی ڈھب کا ہے... آپ اس کے چکر میں آجائیں گے اور ایسے آجائیں گے کہ چکر سے نکل نہیں پائیں گے... ناول غیر محسوس طور پر آپ کو اپنی گرفت میں لیتا چلا جائے گا... محسوس تو آپ کو اس وقت ہوگا جب ناول ختم ہونے کے قریب ہوگا... اس وقت آپ کو ہٹا چلے گا... آپ خود بھی زنجیر کی قید میں تھے... میں آپ کو رہائی کی جھلکی مبارکباد دیتا ہوں... جی ہاں اور کیا۔

چلیے اللہ کا شکر ہے... فاروق احمد صاحب پھر سے فارم میں آگئے اور میرا یہ خیال خام ثابت ہو گیا کہ گزشتہ ناول میری زندگی کا آخری ناول ثابت ہونے کا امکان ہے... وہ دو باتیں کافی جلی کٹی تھیں... شاید ان دو باتیں نے فاروق احمد صاحب کو اپنی گرفت میں لے لیا ہوگا... مطلب یہ کہ انہیں زنجیر میں جکڑ لیا ہوگا... لیجیے اب فاروق احمد دو باتیں کی زنجیر میں جکڑ گئے... آج تو ہر کوئی زنجیر کا قیدی بننا نظر آ رہا ہے... اللہ اپنا رحم کرے۔

اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں زنجیر کی گردان چھوڑ دوں اور کوئی اور بات شروع کر دوں... سوال یہ ہے کہ کیا بات کی جائے... دو باتیں تو ہیں زاران کی زنجیر کی...

لوڈ شیڈنگ

”میں تنگ آ گیا ہوں۔“ فاروق نے جھلا کر کہا۔

محمود اور فرزانہ نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تو وہ اور زیادہ جھلا اٹھا۔ اس نے قریب قریب چیخ کر کہا:

”تم دونوں نے سنا نہیں... میں تنگ آ گیا ہوں۔“

”ہم بہرے نہیں ہیں... کیوں محمود۔“

”میں صرف اپنے بارے میں یہ بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔“ محمود مسکرایا۔

”کون سی بات؟“ فرزانہ نے اسے گھورا۔

”یہ کہ ہم بہرے نہیں ہیں۔“

”ہائیں... تم... تم میرے کانوں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔“ فرزانہ جھلا کر بولی۔

”بالکل جانتا ہوں... لیکن کیا خبر... عین اس لمحے کیا ہو جائے۔“

”اچھا اچھا... ادھر ادھر کی نہ ہانگو... ورنہ میں بھی تنگ آ جاؤں گی۔“

”لیکن کس سے۔“

”یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم... فاروق ہی اس پر روشنی ڈال سکتا ہے۔“

”لوڈ شیڈنگ نے اس قابل کب چھوڑا ہے۔“ فاروق نے

سر دھڑکائی۔

”کس قابل؟“ دونوں ایک ساتھ بولے۔

”روشنی ڈالنے کے قابل۔“ فاروق نے دانت نکالے۔

”دھت تیرے کی۔“ محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ

مارا۔

”ہے کوئی تنگ... اب تک دونوں نے یہ تنگ نہیں پوچھا کہ

میں کس بات سے تنگ آ گیا ہوں۔“

”چلو فرزانہ... پوچھ لو بے چارے سے۔“ محمود بولا۔

”تو تم کیوں نہیں پوچھ لیتے۔“

”یہ کیا پوچھا پچھایا جا رہا ہے۔“ بیگم جمشید نے باورچی

خانے سے ہانک لگائی۔

”جی صرف یہ کہ فاروق کس بات سے تنگ ہے...“

”اوہ اچھا... ہائیں... کیا مطلب... تو کیا فاروق کسی بات سے تنگ ہے۔“

”جی ہاں اس کا بیان یہی ہے۔“ محمود نے جواب دیا۔
 ”اللہ نہ کرے... میرا لال کسی بات سے تنگ ہو... ٹھہرو فاروق! میں ابھی آتی ہوں... بس میں اپنے کام سے فارغ ہونے والی ہوں۔“ وہ بولیں۔

”اوہو! امی جان! ایسی کوئی بات نہیں... شہر کے اندیشے میں دہلی نہ ہوں۔“ فاروق نے گھبرا کر کہا۔
 ”ہائیں ہائیں... فاروق یہ تم اپنی بات میں شہر کہاں سے لے آئے۔“

”محاورات کے دلیں سے۔“ فاروق مسکرایا۔
 ”لیکن میں قاضی کب ہوں... شہر کے اندیشے میں تو بے چارے قاضی صاحبان دبلے ہوتے رہتے ہیں۔“ بیگم جمشید نے بلند آواز میں کہا۔

”بات دور جاتی نظر آتی ہے... کہیں ہم یونہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہ مارتے رہیں۔“

”ناچ نہ جانے آگن ٹیڑھا۔“ فاروق نے منہ بنایا۔
 ”ہے کوئی تک... یہاں اس ضرب المثل کا کون سا موقع

تھا۔“ محمود جھلا اٹھا۔

”اب موقع اور محل کی تلاش میں کون لوہے کے چنے چبائے۔“ فاروق مسکرایا۔
 ”دماغ چل گیا شاید۔“ فرزانہ کاٹ کھانے کے انداز میں بولی۔

”توبہ ہے تم سے... فاروق جلدی بتاؤ... آخر تم کس بات سے تنگ آ گئے ہو۔“

”اس بات سے کہ ہم جب بھی سیر کا پروگرام بناتے ہیں... کوئی نہ کوئی کیس پلے پڑ جاتا ہے... آج تک ایسا نہیں ہوا کہ سیر کا پروگرام سیر کا ہی ثابت ہوا ہو۔“ فاروق نے منہ بناتے ہوئے کہا۔
 ”لیکن یہ بات تمہیں سوچنی کیوں... سوال تو یہ ہے... ہم کون سا سیر کا پروگرام بنا رہے ہیں۔“

”ایسا کوئی پروگرام بننے دیر بھی کیا لگتی ہے... بلکہ تم کہو تو میں بنا کر دکھاؤں۔“ فاروق کی آواز میں شوخی آگئی۔
 ”حد ہوگئی... اب لگے زبردستی سیر کا پروگرام بنانے... وہ بھی بیٹھے بٹھائے۔“ فرزانہ نے جل کر کہا۔

”اگر سیر کا پروگرام بن جاتا ہے تو اس میں حرج بھی کیا ہے... یوں بھی ان دنوں دسمبر کی چھٹیاں ہیں... سردیاں عروج پر

نے جلدی جلدی کہا۔

”چلو مانا... میں یہ بات بھول رہا تھا... تم نے یاد کرادی... اب تم سنو! تم یہ بھول رہے ہو کہ اس کے باوجود میرا پروگرام بن کر رہتا ہے... ابا جان ہمیں گھورتے ضرور ہیں، لیکن بات اس سے آگے نہیں بڑھ پاتی... پانی سر سے اونچا نہیں ہو پاتا... پروفیسر اکل اور اکل خان رحمان معاملے کو سنبھال لیتے ہیں۔“

”ہاں! اس میں تو خیر کوئی شک نہیں۔“ فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

”بس تو پھر میں اکل خان رحمان کو فون کرنے لگا ہوں۔“

”کوشش کر لو... منہ کی کھاؤ گے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”گویا تم اس پروگرام میں میرا ساتھ نہیں دوں گے، اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناؤ گے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں... اگر تم پروگرام طے کرانے میں کامیاب ہو گئے تو ہم دونوں ساتھ جانے میں تمہارا ساتھ دیں گے... لیکن ایک شرط ہے۔“ محمود نے کہا۔

”اے کہتے ہیں... کچی پکائی اور وہ بھی دو دو۔“ فاروق نے جلے کئے انداز میں کہا۔

”نہیں خیر... اے تو یہ نہیں کہتے... یوں بھی محاورہ ہے،

ہیں... تفریحی مقامات پر ان دنوں برف باری ہو رہی ہے... تو کیوں نہ برف گرنے کے مناظر دیکھیں۔“

”اوہ... ارے... ہائیں... یہ تو باتوں باتوں میں پروگرام ترتیب دے گیا... حیرت ہے، کمال ہے...“ محمود نے چونکنے کے انداز میں کہا۔

”ابا جان فوراً انکار کر دیں گے۔“

”ہم ان سے کہیں گے ہی کیوں... پہلے بھی جو ترکیب اختیار کرتے رہے ہیں... اسی کو آزمائیں گے۔“ فاروق پر گویا سیر کے پروگرام کا بھوت سوار تھا۔

”تمہارا مطلب ہے... اکل خان رحمان یا پروفیسر اکل کے ذریعے۔“

”ہاں بالکل۔“

”لیکن تم شاید بھول رہے ہو۔“ فرزانہ نے منہ بتایا۔

”چلو جو میں بھول رہا ہوں، تم یاد کرادو... پھر جو تم بھول رہی ہوگی، میں یاد کرادوں گا۔“ فاروق اب بھی اسی لہجے میں بات کر رہا تھا۔

”تم بھول رہے ہو کہ ہماری یہ ترکیب ابا جان ہر مرتبہ فوراً بھانپ لیتے ہیں... لہذا اس مرتبہ بھی ہم پکڑے جائیں گے۔“ محمود

چڑی اور دودو۔“

”یہ ہم محاوروں کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے۔“ فرزانہ نے منہ بتایا۔

”پتا نہیں... پوچھ کر بتائیں گے۔“ فاروق بڑبڑایا۔

”پوچھ کر بتائیں گے... لیکن کس سے۔“ فرزانہ نے حیران ہو کر پوچھا۔

”محاورات سے اور کس سے۔“ محمود نے فوراً کہا۔

”حد ہو گئی... تو بہ ہے تم سے۔“

”اور وہ تمہاری شرط کیا ہے۔“ فرزانہ نے پوچھا۔

”یہ کہ ابا جان بات کو بھانپ نہ سکیں... ہم ہر بار لاکھ کوشش کرتے ہیں کہ وہ اندازہ نہ لگا پائیں... لیکن پھر بھی وہ جان جاتے ہیں۔“ محمود نے کہا۔

”ایسی ترکیب تو پھر فرزانہ ہی بتا سکتی ہے۔“

”اچھی بات ہے... تم دونوں بھی کیا یاد کرو گے... بس مجھے چند منٹ دے دو سوچنے کے لیے۔“

”لے لو... کوئی بات نہیں۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔

اور پھر فرزانہ سوچ میں گم ہو گئی... کافی دیر بعد اس نے سر اٹھایا اور بولی:

”بہت مشکل ہے۔“

”کیا بہت مشکل ہے... اور پھر مشکلات سے ڈرنے والے

ہم کب سے ہو گئے۔“ محمود نے بڑا سامنے بتایا۔

”معاملہ ہے ابا جان کا... وہ تو چڑتی اڑیا کے پر گن لیتے

ہیں۔“ فرزانہ نے خیالات میں گم انداز میں کہا۔

”کس کے پر گن لیتے ہیں؟“ محمود چونکا۔

”چڑتی... مم... میرا مطلب ہے... اڑتی چڑیا کے۔“

”واقعی! یہی بات ہے... لیکن ہم کیا کریں... ہمیں

پروگرام ترتیب دینا ہے... اس طرح کہ ابا جان کو کانوں کان پتا نہ

چلے کہ یہ پروگرام بنانے والے ہم ہیں... پھر ہم صرف سپر کے لیے

جائیں گے... کسی کیس کو گھاس نہیں ڈالیں گے... آنکھ اٹھا کر نہیں

دیکھیں گے... اس طرح انشاء اللہ ہم سیر کر کے کامیابی سے لوٹیں

گے۔“ محمود کہتا چلا گیا۔

”دعی تو میں کہہ رہا ہوں... آخر ایسی کیا ترکیب کہ سانپ

بھی مر جائے اور لاشی بھی نہ ٹوٹے... ہنگ لگے نہ مھلکوی... رنگ

دی چوکھا آئے۔“ فاروق نے کہا۔

”کوئی محاورہ رہ تو نہیں گیا۔“ محمود بھنا کر بولا۔

”اس جملے کی حد تک تو یہ دو ہی کافی ہیں۔“ فاروق

”بس تم دیکھتے جاؤ.... مجھ پر چھوڑ دو۔“

”چلو پھر بسم اللہ کرو۔“ محمود نے کندھے اچکائے۔

”لیکن خیال رہے.... پروگرام تو بن ہی جائے گا اور ہم چل

بھی پڑیں گے.... اصل معاملہ ہے.... کسی کیس کا سامنا ہونے

کا....“

”نہیں ہوگا.... اس بار ہم کیس کو جھکائی دے جائیں گے۔“

”کیا کہہ رہی ہو.... کیس کو جھکائی....“ فاروق نے

چونک کر کہا۔

”لیکن افسوس! یہ کسی ناول کا نام نہیں ہو سکتا۔“ محمود

مسکرایا۔

”توبہ ہے تم سے۔“ فاروق نے اسے گھورا۔

آخر وہ اپنی والدہ کو بتا کر گھر سے نکل گئے.... انیسٹر

جشید ابھی تک گھر نہیں آئے تھے جب کہ ان کے آنے کا وقت ہو چکا

تھا.... اور اسی لیے انہوں نے ٹکٹے کی جلدی کی.... کہ کہیں یہیں نہ

روک لیے جائیں.... جلد ہی وہ خان رحمان کے ہاں پہنچ گئے.... لیکن

خان رحمان گھر میں نہیں تھے.... انہوں نے بڑے بڑے منہ بتائے اور

تجربہ گاہ کا رخ کیا.... پھر جونہی انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع اندر

بجوائی.... انہوں نے تیز تیز قدموں کی آواز سنی اور یہ دیکھ کر ان کے

مسکرا دیا۔

”اس کی صرف ایک ترکیب ہے۔“ فرزانہ نے جلدی سے

کہا۔

”اور وہ کیا؟“ محمود بولا۔

”ہم پروفیسر انکل یا انکل خان رحمان کو خود نہ کہیں.... اپنی

حرکات اور سکناات کے ذریعے انہیں یہ احساس دلا دیں کہ کسی مقام کی

سیر کے لیے جانا چاہیے.... اور پھر وہ اپنے طور پر ابا جان کو فون

کریں.... مطلب یہ کہ ہم جب اپنے منہ سے نہیں کہیں گے تو ابا جان

یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ یہ سب کیا دھرا ہمارا ہے.... بلکہ خود انکل خان

رحمان اور پروفیسر انکل ہم سے کہیں کہ بھئی سیر کا پروگرام بتاؤ۔“

”بھلا وہ حرکات اور سکناات کیا ہو سکتی ہیں۔“ محمود نے

حیران ہو کر کہا۔

”یہ سوچنا بھی فرزانہ کا کام ہے.... ہمیں تو یہ جو کہے گی، کر

گزریں گے۔“

”میرا خیال ہے.... ہم پہلے انکل خان رحمان کے ہاں چلتے

ہیں.... دال گل گئی تو ٹھیک.... ورنہ پھر پروفیسر انکل کے دروازے پر

دستک دیں گے۔“

”اوہو.... ہم وہاں کہیں گے کیا۔“ محمود جھلا اٹھا۔

رحمان کی طرف دیکھا۔

”گھر سے چلے دقت پہلے مجھ سے بات کر لیتے تو ادھر جانے سے بچا جاتے۔“

”لیکن اب کیا ہو سکتا ہے... اب تو چڑیاں کھیت چک گئیں۔“ قاروق بولا۔

”ہائیں ہائیں... تمہیں ہو کیا گیا قاروق... محاورے پر محاورہ جڑے جا رہے ہو۔“

”اے محاورات کا بخار ہو گیا ہے۔“ فرزانہ نے منہ بتایا۔
”اوہ! بہت افسوس ہوا... اللہ رحم فرمائے۔“ پروفیسر داؤد

نے ہمدردی بھرے لہجے میں کہا، پھر زور سے چونک کر بولے:
”ہائیں! کیا کہا تم نے... کک... کون سا بخار۔“

”محاورات کا بخار۔“
”اوہ... اچھا خیر... ہاں تو کیا بات ہو رہی تھی۔“

”آپ کہہ رہے تھے... ہم بہت اچھے موقع پر آئے ہیں... آپ ہمیں یاد کر رہے تھے۔“

”بالکل ٹھیک... دراصل ہم کہیں سیر کا پروگرام بنا رہے تھے... کہ تم آگئے۔“

”اب بات سمجھ میں آئی... لیکن اکل کیا فائدہ۔“ قاروق

چہرے کھل اٹھے کہ پروفیسر داؤد کے ساتھ خان رحمان بھی چلے آ رہے تھے:

”اے کہتے ہیں چڑی اور دو دو۔“ قاروق چکا۔
”ہائیں ہائیں... تم نے ہم دونوں کو چڑی روٹیاں کہا۔“
پروفیسر داؤد نے آنکھیں نکالیں۔

”جج... جی نہیں اکل... زبان پھسل گئی... دراصل میں کہنا چاہتا تھا... اے کہتے ہیں... پانچوں گئی میں سرکڑا ہی میں۔“ قاروق نے گھبرا کر کہا۔

”غلط... بالکل غلط... ہاں تم یہ کہہ سکتے تھے... بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔“

”اب آپ ہمیں بلی بنانے پر تل گئے۔“ قاروق ہنسا۔
”اللہ سے ڈرو قاروق... ہم کیوں تلے... تلے ہمارے دشمن۔“

”شاید ہم اندر جانا بھول گئے۔“ فرزانہ نے یاد دلایا۔
”اوہ ہاں... ہاں آؤ آؤ... بھی... بہت ہی اچھے موقع

پر آئے... ہم تم لوگوں کو ہی یاد کر رہے تھے۔“ پروفیسر پر جوش انداز میں بولے۔

”اور ہم پہلے آپ کی طرف گئے تھے۔“ محمود نے خان

نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

”کس بات کا کیا فائدہ.... مجھے تو یہاں دور دور کی نقصان کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے۔“ خان رحمان نے حیران ہو کر کہا۔

”اور مجھے بھی خان رحمان۔“ پروفیسر مسکرائے۔

”شکریہ پروفیسر صاحب۔“

”آپ سمجھتے نہیں اٹکل۔“

”خیر.... جو ہم نہیں سمجھتے، وہ تم سمجھا دو۔“

”مطلب یہ ہے کہ جو نمی ہم سیر کے لیے نکلیں گے.... کوئی نہ کوئی کیس پلے پڑ جائے گا۔“

”بھئی نہیں پڑے گا.... میں اور پروفیسر صاحب روک لیں گے.... میرا مطلب ہے، معاملے کو سنبھال لیں گے۔“

”خیر.... آپ کہتے ہیں تو کڑا ہی میں سردے دیتے ہیں.... موسلوں کو بعد میں دیکھ لیں گے۔“ قاروق نے جلدی سے منہ بنا کر کہا، حالانکہ دل ہی دل میں وہ خوش ہو رہا تھا کہ بات خود بخود اس رخ پر چل پڑی ہے.... جس رخ پر وہ کسی نہ کسی طرح لانا چاہتے تھے۔

”ارے بھائی.... اوکلی میں سردینا پڑے گا.... کڑا ہی میں نہیں.... کیونکہ موسلوں کا تعلق اوکلی سے ہے.... نہ کہ کڑا ہی سے۔“

”ایک تو ہم اس کی محاورہ بازی سے تنگ آ گئے ہیں.... مچ

سے محاورے ہی محاورے نکل رہے ہیں اس کی زبان سے۔“ محمود نے تملائے ہوئے انداز میں کہا۔

”چلو نکالنے دو بھئی.... ہمارا کیا جاتا ہے۔“

”اب سوال یہ ہے کہ سیر کے لیے جانا کس طرف ہے۔“

”وادی فرقاب۔“ خان رحمان نے اس کی طرف منہ کرتے ہوئے کہا۔

”ارے باپ رے.... ہم نے تو سنا ہے.... وہ بہت

خوفناک وادی ہے۔“ قاروق کانپ گیا۔

”ہوا کرے.... ہمیں کیا۔“ پروفیسر داؤد نے کندھے

اچکائے۔

”جیسے آپ کی مرضی.... لیکن خوفناک وادی میں سیر کا کیا

محرز آئے گا۔“

”بلا لیں اسے۔“ خان رحمان بولے۔

”گگ.... کسے؟“ پروفیسر بولے۔

”جی.... حرے کو.... اور کسے۔“ خان رحمان بولے۔

”اوہ ہاں! ٹھیک تو ہے.... محمود، قاروق اور فرزانہ! تم

حرے کی فکر چھوڑو.... اور چلنے کی تیاری کرو۔“

”کیسے کریں.... کیا آپ ہمیں ابا جان سے اجازت دلوا

سیر کا کیا خاک حرہ آئے گا... ویسے میں جانتا ہوں... اس وقت محمود، فاروق اور فرزانہ یہاں ہیں اور سیر کا پروگرام یہ لے کر آئے ہیں۔“

”جشید! تم جانتے ہو، ہم جھوٹ نہیں بولتے۔“

”اس میں تو مجھے کوئی شک نہیں۔“ ان کی آواز گونجی۔

”تب پھر جان لو جشید کہ ہم سیر کا پروگرام پہلے ہی بنا رہے تھے... یعنی میں اور پروفیسر صاحب... ایسے میں محمود، فاروق اور فرزانہ بھی آگئے... اور ہم نے ان کے سامنے اپنا پروگرام رکھا... خود انہوں نے بھی کہا ہے کہ دادی فرقاب تو بہت خوفناک دادی ہے... ہم نے کہا... ہوتی رہے... ہم تو وہیں جائیں گے... اب انہوں نے کہا کہ ابا جان سے بات کر لی جائے... انہوں نے یہ خدشہ بھی ظاہر کیا تھا کہ تم ان پر شک کرو گے۔“

”وہ تو خیر میں اب بھی کر رہا ہوں۔“

”ہائیں جشید! یہ... یہ تم نے کیا کہہ دیا... کیا میں نے جھوٹ بولا ہے۔“

”نہیں... تم نے جھوٹ نہیں بولا... اس کے باوجود تم انہیں نہیں جانتے۔“

”یہ تم نے ایک اور کہی... ہم اور انہیں نہیں جانتے گے... کمال کرتے ہو جشید۔“

دیں گے۔“

”اجازت کیا... ہم انہیں بھی ساتھ لے جائیں گے۔“

پروفیسر بولے۔

”لیکن شامت تو ہماری آئے گی... ابا جان یہ خیال کریں گے کہ سیر کا پروگرام ہم نے بنایا ہے...“

”ہم تم لوگوں کی صفائی دیں گے۔“ پروفیسر بولے۔

”اور جشید کو یقین کرنا ہوگا، کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی جھوٹ نہیں بولتا... یہ جشید اچھی طرح جانتے ہیں۔“

”چلیے پھر ٹھیک ہے... ابا جان گھر آگئے ہوں گے... آپ اس سلسلے میں انہیں فون کریں گے... یا ہمارے ساتھ گھر چلیں گے۔“

”ابھی سفر کی تیاری تو کرنی ہوگی... لہذا فون پر بات کر لیتے ہیں۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“

اب خان رحمان نے نمبر ملایا اور انسپکٹر جشید کی آواز سنتے ہی بولے:

”یار جشید... ہم لوگ دادی فرقاب جا رہے ہیں۔“

”ارے باپ رے... سنا ہے، بہت خوفناک دادی ہے... راتے اس قدر دھور گزار ہیں کہ ہر قدم پر دل دھڑکتا ہے... ایسی جگہ

”یہ کہ ہم ہر معاملے میں... ہر حال میں تمہارے ساتھ جاتے ہیں... تم اشارہ کرو اور ہم ساتھ نہ جائیں... کیا آج تک ایسا ہوا ہے۔“

”بالکل نہیں ہوا... نہ آئندہ ہوگا... اور میں ساتھ چل رہا ہوں... میں ان تینوں سے بھی بہت خوش ہوں... چلو اس بہانے وادی فرقاب دیکھ لیں گے... آج تک اس کی خوفناکی کے بارے میں سنتے رہے ہیں... اب اس کی خوفناکی کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔“

”بالکل ٹھیک جمشید۔“
 ”لیکن ابا جان اور انکلو... ہماری ایک شرط ہے... اور بہت کڑی شرط ہے۔“
 ”شرط... کیسی شرط۔“

☆☆☆☆☆

”ہاں! کمال تو کرتا ہوں میں... جہاں تک میرا خیال ہے... یہ تینوں یہاں سے سیر کا پروگرام لے کر گئے تھے... اب یہ اور بات ہے کہ تم پہلے ہی سیر کے پروگرام پر بات کر رہے تھے... لہذا انہیں اشارہ بھی کوئی بات نہیں کرنی پڑی... اب ان سے پوچھ لو... میرا اندازہ درست ہے یا غلط۔“

خان رحمان اور پروفیسر دادو نے ایک ساتھ ان کی طرف دیکھا:

”کیوں بھئی۔“

”جج... جی ہاں! یہی بات ہے۔“
 ”دیکھا... تم نے۔“ انپکڑ جمشید زور سے بنے۔
 ”حد ہو گئی... یار جمشید... تم ہو کیا بلا۔“ پروفیسر بولے۔
 ”میں بلا نہیں... جمشید ہوں۔“ انہوں نے فوراً کہا۔
 ”اچھا خیر... اب کچھ بھی ہو... ہم سیر پر جا رہے ہیں... اور تم ساتھ چل رہے ہو اور ہماری شرط یہ ہے کہ تم ایک لفظ بھی ان تینوں کو نہیں کہو گے... نہ ناراض نظروں سے ان کی طرف دیکھو گے... کیونکہ تم جانتے ہی ہو جمشید۔“ یہاں تک کہتے کہتے خان رحمان کا لہجہ جذباتی ہو گیا۔

”میں جانتا ہی ہوں... لیکن کیا؟“

۱۱۱-

”بالکل ٹھیک۔“ انسپکٹر جمشید ہنس پڑے۔
 ”ابا جان!“ قاروق نے نعرہ لگوانے کے انداز میں کہا۔
 ”زندہ باد...“ ان تینوں کے ساتھ خان رحمان اور
 پروفیسر داؤد نے بھی کہا۔

دوسرے دن وہ صبح سویرے نماز ادا کرنے کے بعد نکل
 کھڑے ہوئے۔ خان رحمان کی بڑی گاڑی میں ضرورت کی تمام
 چیزیں رکھ لی گئی تھیں... کھانے پینے کی چیزوں کو گرم اور ٹھنڈا کرنے
 تک کا انتظام کیا گیا تھا... گویا انہیں راستے میں کسی سے کسی قسم کا بھی
 رابطہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ موسم بھی بہت خوش گوار تھا... ان
 دنوں ہلکی سردی شروع ہو چکی تھی... گویا نہ گرمی محسوس ہوتی تھی... نہ
 سردی... اور ایسا ہی موسم حرے دار ہوتا ہے... ایک گھنٹے کے سفر کے
 بعد وہ شہر کے سرے پر پہنچ گئے... اور اس سڑک کی طرف مڑ گئے...
 جو سیدھی وادی فرقاب کی طرف جاتی تھی... لیکن سڑک پر چڑھے
 نہیں تھے کہ ایک درخت پر لگے بڑے سے بورڈ نے خان رحمان کی
 توجہ اپنی طرف کر لی... انہوں نے گاڑی کو اچانک بریک لگا دیے:
 ”انکل... خبردار! معاملے کی خلاف ورزی نہ کریں۔“
 ”ایسی کوئی بات نہیں بھی... فکر نہ کرو...“

حویلی

”ہماری شرط یہ ہے کہ ہم صرف سیر کریں گے... کوئی کیس
 حل نہیں کریں گے... کوئی کیس نظر آجائے تو اس سے آنکھیں چرا کر
 گزر جائیں گے... آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھیں گے...
 چاہے کیس بے چارہ پاؤں پتھارہ جائے۔“
 ”یہ تو میرے لیے ممکن نہیں... ہاں اس کی ایک صورت
 ہو سکتی ہے، یہ کہ کیس اکرام یا خفیہ فورس کے انچارج کے حوالے کر دے
 آگے چلے جائیں گے... انہیں ضرورت پڑے تو فون پر ہم سے
 رہنمائی لے لیں... یعنی ہم عملی طور پر کچھ نہیں کریں گے۔“
 ”چلیے! آپ کی یہ بات ہم منظور کیے لیتے ہیں۔“
 ”بس تو پھر ہم لوگ کل صبح سویرے وادی فرقاب کی طرف
 روانہ ہوں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے فیصلہ سنایا۔
 ”اور ہمارے پاس پتھر لگانے کا پورا سامان ہوگا... تاکہ
 ہمیں راستے میں کسی سے مدد لینے کی ضرورت نہ پڑے۔“ قاروق۔

”خیر خیر... اکل خان رحمان تو کاروباری آدمی ہیں نا... لہذا ان کی خاطر ہی سہی... اس بورڈ کو پڑھ لیتے ہیں۔“

”لیکن خبردار... یہ صرف ایک بورڈ ہے... اور اکل خان رحمان اس سے کاروباری فائدہ اٹھانا چاہیں تو اٹھا سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے... کوئی اعتراض نہیں۔“

اس وقت تک خان رحمان بورڈ پر مکمل تحریر پڑھ چکے تھے... اب انہوں نے پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا:

”یہاں سے صرف ایک کلومیٹر آگے بائیں طرف بہت بڑا رقبہ برائے فروخت ہے... رقبے کے کنارے مغلیہ دور کی ایک حویلی بھی فروخت کی جائے گی... خواہش مند حضرات اس نمبر پر رابطہ کریں۔“

تحریر پڑھنے کے بعد خان رحمان بولے:

”کیا خیال ہے... اس تحریر سے کسی کیس کی یوٹو نہیں آ رہی۔“ خان رحمان مسکرائے۔

”جی نہیں... آپ شوق سے رابطہ کریں۔“ تینوں ایک ساتھ بولے۔

”شکریہ!“ خان رحمان نے کہا اور موبائل پر وہ نمبر ملائے... جلد ہی ایک کمزور سی آواز سنائی دی:

”ہم سیر کے لیے نکلے ہیں... طے یہ ہوا ہے کہ کسی کیس کے چکر میں نہیں پڑیں گے... لہذا آپ کا اس طرح رکنا... ہمارے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔“

”جی نہیں... ایسی کوئی بات نہیں... تم لوگ ذرا اس بورڈ پر ایک نظر ڈال لو... اور یہ بات جان لو کہ اس بورڈ سے خطرے کی بو بالکل نہیں آ رہی... ہاں منافع کی بوضرور نظر آ رہی ہے۔“ انہوں نے پر جوش انداز میں کہا۔

”منافع کی بو... کیا مطلب...“ فاروق اچھل پڑا۔

”کیا ہوا بھئی... خیر تو ہے...“ پروفیسر داؤد نے بڑا سا منہ بتایا۔

”وہ... وہ... یعنی کہ اکل! یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔“

”ہو سکتا ہوگا... لیکن ہم سیر کے لیے نکلے ہیں۔“ فرزانہ جھلا اٹھی۔

”میں کسی کیس کی بات نہیں کر رہا... منافع کی بات کر رہا ہوں۔“

”اور ہم کوئی کاروباری لوگ نہیں ہیں۔“ محمود نے جھلا کر کہا۔

تھے... وہ کافی لمبا چوڑا تھا... انہوں نے گاڑی وہیں روک دی اور پیدل اس کی طرف چل پڑے... نزدیک پہنچ کر انہوں نے ایک ساتھ کہا:

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم السلام... خوش آمدید۔“ اس نے آگے بڑھ کر ان کا

استقبال کیا۔ پھر اس نے کہا:

”خوشی ہوئی... آپ لوگوں سے مل کر... آپ پہلے چائے پینا پسند کریں گے یا میں پہلے زمین آپ کو دکھاؤں... ویسے میرا نام داراب خان شمشیر ہے۔“

”ہم چائے وائے نہیں پیئیں گے... بس آپ زمین دکھا

دیں اور اسی کا رخ بتادیں۔“

اس کی زمینیں حویلی کے پچھلی طرف تھیں... وہ انہیں اس طرف لے آیا... انہوں نے دیکھا... کھیت ہری بھری فصلوں والے تھے... فصلیں لہلہا رہی تھیں:

”حیرت ہے... یہ تو فصلیں تیار کھڑی ہیں... پہلے آپ

فصلیں کٹوا لیتے... پھر زمینیں بیچتے۔“ خان رحمان بولے۔

”ہاں! آپ ٹھیک کہتے ہیں... لیکن میں مجبور ہوں... مجھے

فوری طور پر رقم کی ضرورت پیش آگئی ہے...“ اس نے سرد آہ

”جی... فرمائیے... کون صاحب ہیں؟“

”میرا نام خان رحمان ہے... میں آپ کا یہ بورڈ پڑھ کر رُک

ہوں... زمین خریدنا میرا شوق ہے... اگر آپ مجھ سے بات کرنا پسند کریں تو۔“

”بھلا میں کیوں نہ بات کروں گا... آپ تشریف لے آئیں... یہاں سے ایک کلو میٹر آگے آ کر بائیں طرف ایک کچی سڑک نظر آئے گی... بس اس پر آجائیں... میں حویلی کے دروازے پر کھڑا ہوں گا۔“

”بہت خوب! ہم آرہے ہیں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے ان کی طرف دیکھا اور بولے:

”ہاں! بھئی... میں تم سے ایک بار پھر پوچھتا ہوں... کوئی اعتراض ہو تو ہم آگے بڑھ جاتے ہیں... لیکن ظاہر ہے... یہاں دور دور تک کسی کیس کا نام و نشان نہیں۔“

”یہی بات ہے اکل! آپ شوق سے ان سے مل لیں۔“

خان رحمان مسکرا دیے۔ جلد ہی وہ کچی سڑک پر اتر گئے... کچی سڑک درختوں کے ایک جھنڈ پر ختم ہو گئی اور اس جھنڈ کے دوسری طرف انہیں وہ پُرانی حویلی دکھائی دی... اس کا دروازہ کھلا تھا اور درختوں کے درمیان سے وہ دروازے پر کھڑے شخص کو دیکھ سکتے

”خیر! میں یہ زمینیں خریدنے کے لیے تیار ہوں... آپ بتائیں... ان ساری زمینوں کا رقبہ کتنا ہے... اور آپ ان کا کیا لینا چاہتے ہیں۔“

”یہ بیس ایکٹر زمین ہے... نہایت زرخیز اور میں یہ ایک کروڑ میں فروخت کرنا چاہتا ہوں۔“

”کیا مطلب؟“ انپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔
”تمہیں کس بات پر حیرت ہوئی جمشید۔“ پروفیسر داؤدان کی طرف مڑے۔

”میرے خیال میں یہ صاحب بہت کم قیمت لگا رہے ہیں... اتنی زمین اس سے کہیں زیادہ قیمت کی ہے، مجھے حیرت اسی بات پر ہے...“ یہ کہہ کر وہ اس کی طرف مڑے۔
”کیا آپ کو زمین کا گاہک نہیں مل رہا کہ اتنی کم قیمت پر فروخت کر رہے ہیں۔“

”ایک کروڑ کا گاہک ملنا اتنا آسان بھی نہیں ہوتا... اور مجھے ایک کروڑ کی فوری ضرورت ہے۔“
”اور کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کو ایک کروڑ کی ایسی کیا فوری ضرورت ہے۔“ انپکٹر جمشید بولے۔

”آپ اس بات کو چھوڑیں... سودے کی بات کریں۔“
اس نے بڑا سامنہ بنایا۔
”ٹھیک ہے... مجھے یہ سودا منظور ہے...“ خان رحمان بولے۔

”کیا واقعی۔“
”اس میں مذاق کی کیا بات ہے۔“
”مم... میرا مطلب ہے... آپ ایک کروڑ کی رقم فوری طور پر ادا کریں گے۔“

”ہاں! جو طریقہ ہے... اس کے مطابق ادا کروں گا... میرا مطلب ہے... جو نئی رجسٹری ہوگی، رقم ادا کر دی جائے گی۔“
”ہوں! ٹھیک ہے... مجھے منظور ہے... آپ صبح رجسٹری کرالیں۔“

”اوکے... میں اپنے وکیل کو یہیں بلا لیتا ہوں... کاغذات وہی تیار کریں گے اور رقم کی ادائیگی بھی وہی کریں گے۔“
”اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے... آپ میرے ہاں مہمان ٹھہریں... اور وکیل کو بلا لیں... رقم بھی منگوا لیں۔“
”ٹھیک ہے... میں یہی کرتا ہوں۔“

اب وہ اس کے ساتھ واپس پلٹے... کیونکہ اس کی رہائش

کان میں کہا۔

”کیوں خیر تو ہے۔“ خان رحمان چونکے۔

”اس کا خیال ہے... ہم غیر محسوس طور پر کسی کیس میں الجھنے چلے ہیں۔“

”کیوں جمشید... کیا تم بھی یہی محسوس کر رہے ہو۔“ خان رحمان ان کی طرف مڑے۔

”میرا خیال نہ پوچھو خان رحمان... ان کے خیال سے گزارہ کرلو۔“

”کیا کہا جمشید... کس چیز سے گزارہ کرلوں۔“ خان رحمان کی بجائے پروفیسر داؤد نے بے خیالی کے عالم میں کہا۔

”فاروق کے خیال سے گزارہ کرنے کا مشورہ دے رہا ہوں۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”میں بھی تمہاری تائید کرتا ہوں...“ وہ فوراً بولے۔

”لیکن اکل... آپ کو پتا بھی ہے... آپ کس سلسلے میں تائید کر رہے ہیں۔“

”فاروق کے خیال سے گزارہ کرنے کے سلسلے میں۔“ انہوں نے فوراً کہا۔

”اور یہ خیال کس سلسلے میں ہے۔“

وہاں سے کچھ پیچھے جنگل کے کنارے پر تھی... اس کے ساتھ چلتے وہ ایک بڑی طرز کی حویلی کے نزدیک پہنچے... دروازے پر دو دیہاتی سے آدمی کرسیوں پر بیٹھے نظر آئے... وہ اسے دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے:

”دروازہ کھولو بھئی۔“ اس نے نرم لہجے میں کہا۔
”اچھا مالک۔“

دونوں نے مل کر دروازے پر خوب زور لگایا، تب وہ کھلا... اب وہ انہیں لیے اندر داخل ہوا... دونوں دیہاتیوں نے دروازہ بند کر دیا۔

”کک... کہیں۔“ فاروق ہکلا یا... آواز دہی دہی تھی۔
”کک... کہیں... کیا۔“ محمود چونکا۔
”کہیں وہ شروع تو نہیں ہو رہا۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔

”ابھی تو ایسی کوئی بات محسوس نہیں ہوئی۔“ فرزانہ نے انکار میں سر ہلایا۔

”میرا خیال ہے... ہمیں اس زمین کا خیال چھوڑ کر اپنی سیر کا پروگرام جاری رکھنا چاہیے۔“ فاروق فکر مند نظر آ رہا تھا۔

”اکل! فاروق فکر مند ہے۔“ فرزانہ نے خان رحمان کے

”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“ انہوں نے کندھے اچکائے۔
 ”اس کا خیال ہے... ہمیں یہیں سے لوٹ چلنا چاہیے... کیونکہ شاید ہم غیر محسوس طور پر کسی کیس میں الجھ رہے ہیں۔“

”اوہ اوہ...“ وہ بولے۔
 ”ہم تجربہ کر لیتے ہیں۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔
 ”وہ... وہ کیسے؟“
 ”ابھی بتاتا ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ داراب خان شمشیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ ان سے چند قدم آگے چل رہا تھا۔ حویلی کے بیرونی دروازے میں داخل ہوتے ہی ایک پختہ سڑک تھی... اس کے دوسرے سرے پر حویلی کا اندرونی دروازہ نظر آ رہا تھا... ابھی وہ سڑک کے درمیان میں تھے... انہوں نے قدرے بلند آواز میں کہا:
 ”ذرا سنیے۔“

داراب خان شمشیر چونک کر مڑا:
 ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟“

”جی ہاں! ہم ذرا دیر کے لیے باہر جانا چاہتے ہیں۔“
 ”کیوں خیر تو ہے۔“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”بس! ایک ضرورت پیش آ گئی۔“
 ”ٹھیک ہے... چلیے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ واپس مڑا... اس کا رخ صدر دروازے کی طرف ہو گیا۔ اب وہ سب باہر آ گئے... انسپکٹر جمشید داراب خان کی طرف مڑے:

”دراصل ہم لوگ وادی فرقاب جا رہے ہیں... اور صرف سیر کی غرض سے جا رہے ہیں... ہمارے ان چھوٹے ساتھیوں نے سیر کے درمیان میں اس خرید و فروخت والے معاملے کو پسند نہیں کیا... یہ چاہتے ہیں، ہم اپنا یہ پُر و گرام صرف سیر تک رکھیں... تو کیوں نہ ہم واپسی پر آپ سے زمین کا سودا کر لیں۔“
 ”کوئی حرج نہیں... لیکن۔“ اس نے کہا۔
 ”لیکن کیا۔“ وہ بول پڑے۔

”اگر اس دوران مجھے کوئی گاہک مل گیا اور اس سے میرا سودا بن گیا تو میں آزاد ہوں گا... یعنی آپ کا پابند نہیں رہوں گا۔“
 ”یہ تو خیر اصولی بات ہے... لیکن...“ خان رحمان بھی کہتے کہتے رُک گئے۔

”اب آپ ایک عدد لیکن لے آئے۔“ فاروق نے منہ

خان رحمان مسکرا دیے، پھر بولے:
 ”لیکن اگر میں اس سے زیادہ رقم لگا دوں تو؟“
 ”اس صورت میں زمین آپ کی ہوگی۔“

”تب آپ میرا موبائل نمبر نوٹ کر لیں... اگر آپ کو کوئی
 گاہک مل جائے تو آپ وہ رقم مجھے بتا دیجیے گا... جو وہ لگائے... اس
 کے بعد میں آپ کو بتاؤں گا کہ میں اس سے زیادہ رقم دے سکتا ہوں یا
 نہیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“

”اور اگر کوئی گاہک آپ کو نہ ملا تو ہم واپسی پر آپ سے سودا
 کریں گے... یہاں کی زمین کا ریٹ معلوم کریں گے... پھر آپ
 سے بات طے ہوگئی تو آپ کو رقم ادا کر دیں گے۔“
 ”ٹھیک ہے۔“

موبائل نمبر نوٹ کرا کے وہ اپنی گاڑی میں سوار
 ہو گئے... اس وقت قاروق کے چہرے پر رونق آگئی:
 ”ہاں قاروق اب کیا کہتے ہو... اسی وقت سودا کر لیں یا
 میرے واپسی پر۔“ خان رحمان بولے۔

”جی اٹکل... میرے واپسی پر۔“ قاروق نے فوراً کہا۔
 ”ٹھیک ہے... یونہی سہی... اس بار ہم سیر کے دوران کیس

کا کوئی خطرہ مول نہیں لیں گے... اگر کہیں کوئی کیس آڑے آتا نظر
 آیا، تب بھی اسے واپسی پر ہی دیکھیں گے۔“
 ”شکریہ اٹکل۔“

اور پھر وہ آگے روانہ ہو گئے:

”اس نے ہمیں روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی... اس سے
 ثابت ہوا کہ وہ کوئی چکر چلانا نہیں چاہتا تھا۔“ پردیسر داؤد نے کہا۔
 ”بالکل سچی بات ہے اٹکل۔“ محمود نے پر جوش انداز میں
 کہا۔

”جسٹس... تمہارا کیا خیال ہے۔“

”وہی جو آپ کا۔“ اس نے فوراً کہا۔

”چلو اچھا ہے... اس بار تو ہم سیر کر ہی گزریں گے...
 انشاء اللہ!“ پردیسر داؤد نے خوش ہو کر کہا۔

اور پھر وہ وادی فرقاب پہنچ گئے... وہاں کے حسین
 نظاروں نے انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایک ہفتہ تک انہوں نے
 خوب جی بھر کر سیر کی... خوب لطف اندوز ہوئے اور کوئی کیس ان
 کے پلے نہ پڑا... اس طرح آخر کار قاروق اپنے مقصد میں کامیاب
 ہوا... نویں دن انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ ادھر اس دوران
 داراب خان شمشیر نے ان سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا جس کا مطلب یہ

تھا کہ اسے ان کے علاوہ ابھی تک کوئی گاہک نہیں ملا تھا۔ لہذا واپسی کا سفر شروع کرتے ہوئے خان رحمان کو امید ہو چلی تھی کہ زمین دی خریدیں گے۔۔۔ اور پھر وہ داراب خان کی حویلی کے سامنے پہنچ گئے۔۔۔

دروازے پر دی دوئی دیہاتی بیٹھے نظر آئے۔ انہیں آتے دیکھ کر وہ کھڑے ہو گئے۔۔۔ پہلے وہ چوکنے سے نظر آئے پھر انہیں پہچان کر ان کے چہروں پر اطمینان نظر آیا:

”اوہ! آپ لوگ ہیں؟“ ان میں سے ایک کے منہ سے نکلا۔

”جی ہاں! میں تو یہ ہم لوگ ہی۔“ فاروق بولا۔

”مہربانی کر کے داراب خان کو ہماری آمد کی اطلاع دیں۔“

”جاؤ جاؤ۔“ دوسرے نے اپنے ساتھی سے کہا۔

وہ کچھ کہے بغیر اندر چلا گیا۔۔۔ جلد ہی اس کی واپسی ہوئی:

”آئیے جناب!“ اس نے کہا۔

وہ اس کے ساتھ اندر داخل ہوئے اور اسی سڑک پر چلے آخر اندرونی دروازے تک پہنچ گئے۔۔۔ اس کے بائیں طرف

ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ دیہاتی نے اس دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”یہ ڈرائنگ روم کا دروازہ ہے۔۔۔ آپ اندر بیٹھیں۔۔۔ مالک ابھی آتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ پھر بیرونی دروازے کی طرف مڑ گیا۔

اب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔۔۔ ڈرائنگ روم بہت کشادہ تھا۔۔۔ دیواروں پر مغل بادشاہوں کی تصاویر بتائی گئی تھیں۔۔۔ دروازے کے سامنے والی دیوار پر ایک خوب صورت نوجوان کی تصویر فریم کرا کے لگائی گئی تھی۔۔۔ یہ کمرے کی تصویر تھی۔۔۔ اور بڑے سائز میں نکلا کر لگائی گئی تھی۔۔۔ انسپکٹر جمشید کی نظریں اس تصویر پر جم کر رہ گئیں۔ کمرے میں صوفے اور کرسیاں پرانی طرز کے تھے۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے صدیوں پرانے ہوں۔ اُن پر شاید ہاتھی دانت کا کام کیا گیا تھا۔۔۔ باقی لوگ کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھ گئے۔۔۔ انسپکٹر جمشید البتہ کھڑے رہ گئے۔۔۔ وہ بدستور اس تصویر کی طرف دیکھ رہے تھے۔۔۔ آخر فرزانہ سے رہا نہ گیا:

”اس تصویر میں کوئی خاص بات ہے شاید۔“

وہ اُس کی آواز سن کر چوکنے۔۔۔ پھر کھوئے کھوئے انداز میں بولے:

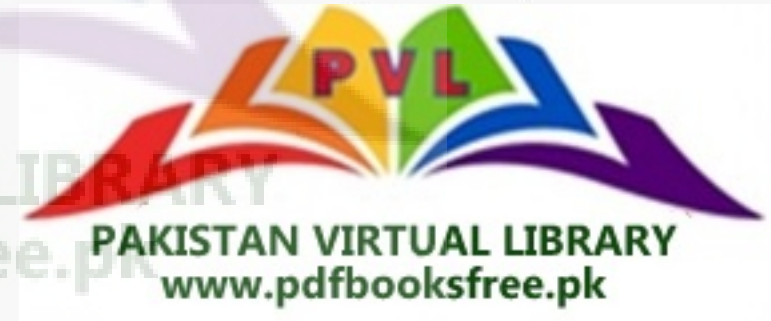
”ہاں فرزانہ... میرے خیال میں یہ تصویر خاص ہے... مجھے ایسا لگتا ہے... جیسے میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے۔“
 ”اُوہ۔“ ان کے منہ سے نکلا۔
 عین اُسی لمحے قدموں کی آواز سنائی دی:

☆☆☆☆☆

داراب خان شمشیر اندر داخل ہوا... اُس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی انہوں نے جان لیا کہ وہ حد درجے پریشان ہے:
 ”تو آپ لوگ آگئے۔“ اس کے منہ سے نکلا۔
 ”خیال تو یہی ہے۔“ فاروق نے فوراً کہا۔
 اُس نے ایک نظر فاروق پر ڈالی پھر بولا:
 ”تب پھر کیا پروگرام ہے۔“
 ”زمین خریدنے کا پروگرام ہے۔“
 ”ساتھ میں یہ حویلی بھی خریدنا ہوگی۔“
 ”ٹھیک ہے۔“

تب پھر میں آپ کو زمین دکھا دیتا ہوں... حویلی کو بھی آپ لوگ اچھی طرح دیکھ بھال لیں... کیا خیال ہے... پہلے زمینیں دیکھیں گے یا حویلی۔“

”پہلے حویلی... اور حویلی سے پہلے ڈرائنگ روم میں لگی اس



”وہ جی وہیں رہتے ہیں۔“

”اور آپ کے بیوی بچے۔“

”وہ بھی ہیں میرے ساتھ... لیکن اب میں یہ حویلی اور

زمین فروخت کر کے شہر جانا چاہتا ہوں۔“

”آپ کے بھائی کا کیا نام ہے۔“

”یہ آپ زمین اور حویلی خریدتے خریدتے میرے بڑے

بھائی کے پیچھے کیوں پڑ گئے۔ اس نے بڑا سامنہ بنایا۔

”اس کی وجہ ہے۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”اور وہ وجہ کیا ہے۔“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میں نے ان صاحب کو شہر میں کہیں دیکھا ہے۔“

”گگ... کیا... واقعی۔“ مارے حیرت کے ان کے منہ

سے نکلا۔

انسپکٹر جمشید اس وقت اس کی طرف بہت غور سے دیکھ

رہے تھے، انہیں بہت حیرت ہوئی کیونکہ بھائی کو تو خوش ہونا چاہیے

تھا، وہ صرف حیران ہوا تھا... جلدی سے بولے:

”ہاں! میرا خیال ہے... مجھے یاد آ جائے گا کہ میں نے

انہیں کہاں دیکھا ہے... محمود تم ذرا اپنے کیمرے میں یہ تصویر محفوظ کر

لو۔“

تصویر کے بارے میں جانتا چاہیں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے کیمرے والی

تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ... یہ میرے بڑے بھائی ہیں... ایک مدت سے

غائب ہیں۔“

”غائب ہیں... کیا مطلب؟“

”آج سے دس سال پہلے یہ اچانک غائب ہو گئے

تھے... آج تک ان کا کوئی سراغ نہیں ملا۔“

”شروع ہو گیا کیس... لیکن خیر... اللہ کا شکر... ہم سیر کا

پروگرام مکمل کر چکے ہیں۔“ فاروق نے منہ بنایا۔

”کیا مطلب؟ وہ چوٹکا۔“

”کیا آپ نے ان کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی

تھی۔“

”ہاں کیوں نہیں... بھلا میں رپورٹ کیوں درج نہ

کراتا۔“

”اور کیا وہ بھی یہیں... آپ کے ساتھ رہتے تھے۔“

”جی نہیں وہ شہر میں رہتے تھے... شہر میں ان کا اپنا کاروبار

تھا۔“

”اور ان کے بیوی بچے۔“

”جی اچھا۔“ اس نے کہا اور اپنے کمرے میں تصویر محفوظ کر لی۔

”آپ اپنا موبائل نمبر نوٹ کروادیں... جو نمبری مجھے یاد آیا... میں آپ کو فون کروں گا۔“

”جی اچھا۔“ یہ کہہ کر اس نے موبائل نمبر نوٹ کروادیا۔

”پہلے ہم حویلی دیکھیں گے... آپ اپنے بیوی بچوں کو ڈرائنگ روم میں لے آئیں... ہم اس دروازے سے باہر نکل کر اندرونی دروازے پر آجاتے ہیں۔ جب وہ اندر آجائیں تو آپ ہمارے لیے بیرونی دروازہ کھول دیجیے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“

وہ کمرے سے نکل آئے...

”یہ کیا جمشید سیر کے لیے جاتے ہوئے نہ سہی... آتے ہوئے تو ہم کیس میں الجھ ہی گئے... خان رحمان بولے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ ہم سیر کر چکے... ان تینوں کی شرط ختم ہو چکی... دوسری بات ہم یہاں زمین اور حویلی خریدنے کے لیے آئے ہیں... کوئی کیس حل کرنے نہیں آئے۔ سودے کی بات کر کے ہم سیدھے اپنے گھر جائیں گے... فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”شکر یہ ابا جان۔“ فاروق خوش ہو گیا۔

الیکٹرک جمشید مسکرا دیے... اُس نے مزید کہا:

”دیے بہتر ہو گا کہ آپ اس تصویر کو ذہن سے نکال دیں۔“

”یہی تو مجھ سے نہیں ہوتا... اور یہ تصویر تو میرے دل میں

نقش ہو گئی ہے۔“

”اُدھو اچھا... کمال ہے۔“ فاروق نے حیرت زدہ لہجے

میں کہا۔

اُسی وقت دروازہ کھل گیا اور داراب خان کی صورت

نظر آئی:

”آئیے جناب۔“

وہ اُس کے ساتھ اندر داخل ہوئے۔ اب وہ ایک بہت

کشادہ محن میں تھے۔ اس محن کے چاروں طرف کمرے تھے۔ کمروں

کے اوپر برجیاں بنائی گئی تھیں... بیرونی دیوار کسی قلعہ کی مانند تھی۔

گویا حویلی کیا تھی... ایک چھوٹا سا قلعہ تھا۔ ایک، ایک کرہ دیکھتے

ہوئے آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ جہاں سے چلے تھے وہیں

آگے... اب داراب خان انہیں چھت پر لے گئے... چھت بھی

صرف کمروں کے اوپر تھی۔ محن والی جگہ خالی تھی۔ برجیوں پر پہرے

داروں یا حملہ آوروں سے بچاؤ کرنے والوں کے لیے کھڑے ہونے

کی جگہ بنائی گئی تھی... مطلب یہ کہ چاروں طرف سے حویلی پر حملہ کرنا آسان کام نہیں تھا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر خان رحمان نے کہا:

”حویلی سے زیادہ ہم اسے ایک قلعہ کہیں گے۔ اس میں فوج کے دو تین دستے سما سکتے ہیں اور باہر سے حملہ کرنے والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جاسکتا ہے... اس لحاظ سے یہ حویلی بہت خوب ہے اور میں زمین کے ساتھ اسے خریدنے کے لیے بھی تیار ہوں... اب ذرا ہو جائے زمینوں کی سیر۔“

”جی ہاں! کیوں نہیں...“

”وہ انہیں باہر لے آیا... اب اُن کا رخ حویلی کے پچھلی طرف تھا۔ انہوں نے دیکھا... حویلی بہت اونچائی پر تھی اور اُس سے ملے ہوئے کھیت بہت نشیب تھے...“

”یہ تمام کھیت... جن پر آپ کو لہلاتی فصلیں نظر آرہی ہیں... میرے ہیں اور یہ 120 ایکڑ ہیں... آپ دیکھ لیں... مجھے ان کا کم از کم ایک کروڑ روپے لینا ہے... اس سے کم میں نہیں... کیونکہ...“ وہ کہتے کہتے رک گیا... کیونکہ کے بعد وہ ذرا چونک سا گیا تھا... جیسے اچانک کوئی خیال آگیا ہو۔

”کیونکہ کیا؟“ انپکڑ جمید نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

”کیونکہ کچھ نہیں۔“ اُس نے جواب دیا۔

”یہ سودا میرے وکیل کے ذریعے ہوگا... وہ زمین اور حویلی کے کاغذات چیک کریں گے... کیونکہ ہو سکتا ہے... اس زمین اور حویلی میں کوئی اور بھی حصے دار ہو... آج کل زمین کی خرید و فروخت کے معاملات میں بہت زیادہ ہیرا پھیری ہو رہی ہے۔“

”ہوں... ٹھیک ہے... لیکن مجھے ذرا جلدی ہے۔“ اس کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

”کل ہی میرا وکیل یہ تمام کام کروادے گا اور ادائیگی بھی

آپ کو کل ہی ہو جائے گی...“

”بہت بہت شکریہ۔“

”اب صرف یہ بتادیں کہ آپ نے اپنے بھائی کی گمشدگی کی

رپورٹ کون سے تھانے میں درج کروائی تھی۔“

”یہ علاقہ شہر کے بالکل سرے کا ہے... اس سے تھانہ کاشی

بن لگا ہے اور اُسی تھانے میں میں نے اپنے بڑے بھائی کی گمشدگی کی

رپورٹ درج کروائی تھی... آج سے دس سال پہلے نو جون تھی اس

دن۔“

محمود نے نام اور تاریخ نوٹ بک میں لکھ لی۔ اس کے

بعد انپکڑ جمید نے کہا:

”اب ہم چلتے ہیں۔“

کوئی ایسی دیکھی بات ہو گئی تو ہم آپ کو کیسے تلاش کریں گے۔“
 ”اوہ ہاں! ٹھیک تو ہے... پتا لکھ لیں 28 نو ماڈل
 ٹاؤن۔“

”شکریہ۔“ انہوں نے کہا اور محمود نے یہ پتا بھی لکھ لیا۔ اس
 کے بعد وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔

”کیا آپ کوئی شک محسوس کر رہے ہیں۔“ فرزانہ نے اُن
 کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”زمینوں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں نہیں... اس کے
 بڑے بھائی کے سلسلے میں میری چھٹی جس مجھے پریشان کر رہی
 ہے... میں نے اس شخص کو کہیں دیکھا ہے... اور انشاء اللہ میں یاد کر
 لوں گا۔“

”لیکن اس سے کیا ہو جائے گا... وہ تو خود یہ کہتا ہے کہ دس
 سال پہلے اُس کا بھائی گم ہو گیا تھا...“

”ہاں! اُس کا کہنا یہی ہے... ہم فرض کر لیتے ہیں... وہ
 واقعی گم ہو گیا تھا... سوال تو یہ ہے کہ میں نے اسے کہاں دیکھا
 ہے... اور اگر میں نے اسے کہیں دیکھا ہے تو پھر وہ شہر میں کہیں موجود
 ہے... اس صورت میں وہ گمشدہ تو نہ ہوا...“

”یہ تو واقعی ایک عجیب بات ہو گئی۔“ محمود نے فوراً کہا۔

”ٹھیک ہے... آپ لوگوں کا شکریہ۔“
 ”چلتے چلتے... اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات پوچھنا
 چاہتا ہوں۔“

”پوچھیے۔“ اس نے قدرے پریشانی ہو کر کہا۔
 ”آپ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی پریشان ہیں... اگرچہ
 آپ اب تک اپنی پریشانی کو چھپانے کی بھرپور کوشش کرتے رہے
 ہیں اور اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں، لیکن یہ بات کم از
 کم مجھ سے چھپی نہیں رہی۔“

”آپ کا خیال غلط ہے... میں قطعاً پریشان نہیں ہوں۔“
 ”اوہ اچھا... تب تو ٹھیک ہے... اچھا یہ حویلی اور زمین
 فروخت کر کے آپ کہاں جانا چاہتے ہیں۔“

”بڑے بھائی کی گمشدگی کے بعد اب یہاں دل نہیں
 لگتا... لہذا شہر میں رہوں گا... فی الحال کرائے کی ایک جگہ لی
 ہے... وہاں رہ کر کوئی جگہ خریدنے کی کوشش کروں گا۔“
 ”جو جگہ آپ نے لی ہے... اس کا پتا لکھوا دیں۔“ انسپکٹر
 جمیل نے کہا۔

”لیکن کیوں...“

”بھئی ہم آپ سے ایک بڑی جگہ خرید رہے ہیں... کل کو

”عجیب بات سے زیادہ یہ بات آئیل مجھے مار والی ہوگئی۔
ہم زبردستی ایک کیس مائل لے رہے ہیں۔“ قاروق نے جلتے کتے لہجے
میں کہا۔

”مائل تو خیر نہیں... مفت میں مل رہا ہے۔“ محمود مسکرایا۔

”اور میں کہتا ہوں... یہ سرے سے کیس بنتا ہی نہیں
... دونوں بھائیوں میں جھگڑا ہوا ہوگا... لہذا بڑا بھائی ناراض ہو کر گھر
سے چلا گیا اور پھر لوٹ کر نہ آیا... ان حالات میں وہ اگر آپ کو شہر
میں کہیں نظر آ جاتا ہے تو اس میں عجیب بات کیا ہے۔“ خان رحمان
نے بھی بحث میں حصہ لیا۔

”تم سمجھے نہیں خان رحمان...“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”خیر تم سمجھاؤ... جو میں نہیں سمجھا۔“ خان رحمان نے براہ راست
منہ بتایا۔

”ہم لوگوں کا تعلق... صرف اور صرف جرائم سے
ہے... یعنی جرائم کی دنیا سے۔ اب اگر میں نے اُس کے بھائی کو کہیں
دیکھ لیا ہے تو جرائم کے سلسلے میں ہی کہیں دیکھا ہوگا...“

”اُوہ۔“ اُن سب کے منہ سے نکلا... اب وہ سمجھے کہ وہ کیا
کہنا چاہتے ہیں... پروفیسر داؤد نے کہا۔

”پھر بھی اس کا مطلب یہ نہیں بنتا کہ اس معاملے میں کوئی

جرم ہوا ہے یا یہ ہمارے خلاف کوئی سازش ہے... کیونکہ دیکھو نہ
... سیر کا پروگرام خالص ہم نے بنایا ہے... اس میں باہر کا کوئی آدمی
شریک نہیں ہوا۔“

”ہاں خان رحمان... تم ٹھیک کہتے ہو۔“

اور پھر وہ شہری حدود میں داخل ہو گئے... اُس وقت
انسپکٹر جمشید نے کہا:

”میں تو ذرا پہلے دفتر جاؤں گا... آپ لوگ گھر چلیں...“

”جی نہیں۔“ وہ ایک ساتھ بولے۔

”کیا کہا... جی نہیں... اس جی نہیں کا کیا مطلب ہے۔“

انسپکٹر جمشید نے حیران ہو کر کہا۔

”کچھ نہیں... ہم گھر نہیں جائیں گے... وہاں جائیں گے
جہاں آپ جا رہے ہیں... یعنی دفتر۔“ پروفیسر بولے۔

”لیکن آپ لوگ وہاں جا کر کیا کریں گے۔“

”یہ دیکھیں گے کہ تم وہاں کس لیے جا رہے ہو۔“ خان

رحمان مسکرائے۔

جواب میں انسپکٹر جمشید بھی مسکرا دیے... وہ دفتر میں

داخل ہوئے تو انسپکٹر اکرام اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ شاید اُسے ان کے

آنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی... ان کی چھٹی کے ابھی دو دن

باقی تھے۔

”خیر تو ہے اکرام... گھبرا کیوں گئے۔“
 ”آپ کو اچانک دیکھ کر... اور یہاں آپ کی آمد کا مطلب
 ہے کوئی کیس پلے پڑ گیا ہے“
 ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا... ہم تمہیں ایک تصویر دکھانا چاہتے
 ہیں۔“

”میں سمجھ گیا... دکھائیے۔“ وہ مسکرایا۔

انسپکٹر جمشید نے محمود کو اشارہ کیا... داراب خان شمشیر
 کے بھائی سرخاب خان کی تصویر کمرے میں محمود نے محفوظ کی
 تھی... اے اے کیمرا آن کیا اور تصویر اکرام کے آگے کر دی:
 ”کیا تم نے اسے کہیں دیکھا ہے اکرام۔“
 اکرام نے نظریں تصویر پر جمادیں... کئی منٹ تک وہ
 اسے غور سے دیکھتا رہا... آخر اس کے چہرے پر حیرت کی بجلیاں
 چمک اٹھیں... وہ پکار اٹھا:
 ”سر... سر... یہ... یہ سرخاب ہے... سرخاب۔“

☆☆☆☆☆

پُرانی خبر

”سرخاب...“ اُن کے منہ سے نکلا۔

ساتھ ہی فرزانہ کے منہ سے نکلا:

”اُدھو... داراب خان کے بڑے بھائی کا نام سرخاب
 خان شمشیر ہی تو ہے... اور سرخاب نام بگڑ کر سرخابی بنتا ہے... گویا
 دس سال پہلے چھوٹے بھائی کو چھوڑ کر غائب ہونے والا شخص اب
 سرخاب نہیں... سرخاب ہے۔“ محمود نے جلدی جلدی کہا۔

”ہاں محمود... ضرور ایسا ہی ہے... لیکن پہلے ہم اکرام کی
 بات سنیں گے... ہاں اکرام... تم سرخاب کے بارے میں کیا جانتے
 ہو۔“

”ایک بہت ہی خاموش مجرم جو کچھ مدت پہلے مارا جا چکا ہے
 ... کسی نے اسے ہلاک کر دیا تھا... اس کی لاش ملی تھی، اخبارات
 میں لاش کی تصاویر شائع ہوئی تھیں... آپ نے بھی غالباً اُس کی
 تصاویر دیکھی ہوں گی...“

”جی ہاں! بالکل... اسی لیے میں نے آپ سب کے لیے طرح طرح کی چیزیں تیار کی ہیں۔“

”بھئی داہ... بھابھی ہوں تو آپ جیسی۔“ پروفیسر داؤد خوش ہو کر بولے... ان کی بات سن کر اُن کی بھوک اور چمک اٹھی تھی۔ کھانے سے انصاف کرنے کے بعد انسپکٹر جمشید نے کہا:

”مجھے لائبریری میں اخبارات کی کچھ پُرانی قائلیں دیکھنا ہیں... اس لیے آپ آرام کریں۔“

”آرام کیا... ہم بھی ساتھ چلتے ہیں... تمہارا ہاتھ بٹائیں گے۔“ خان رحمان نے کہا۔

”اور غالباً آپ داراب خان کے بھائی سرخاب خان کے سلسلے میں اخبارات چھاننا چاہتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ وہ مسکرائے۔

اب وہ سب کے سب لائبریری میں جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ دیکھ کر بیگم جمشید کا منہ بن گیا... اُن کا بیٹا ہوا منہ دیکھ کر وہ ہنس پڑے... جلدی وہ قائلین پر آلتی پالتی مارے اخبارات کی قائلوں میں گم ہو چکے تھے... آخر فرزانہ کی آواز سنائی دی:

”یہ رعبی وہ تصویر۔“

اب تو سب اُس تصویر پر جھک گئے... چند لمحے تک غور

”اوہ ہاں! اب یاد آیا... اس کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ بے چارے داراب خان کو معلوم ہی نہیں کہ اُس کا بڑا بھائی اب اس دنیا میں نہیں رہا... اور جب وہ اس دنیا میں تھا تو ایک مجرم کی زندگی گزار رہا تھا... گویا اپنے بھائی سے جدا ہو کر وہ شہر چلا آیا اور جرائم کی دنیا میں پھنس گیا...“

”بالکل یہی بات ہے سر۔“

”لیکن ابا جان! یہ باتیں داراب خان کو کیوں معلوم نہیں ہیں۔“

”ہو سکتا ہے... اسے معلوم ہوں... اور ہم سے ذکر نہ کیا ہو... خیر... رجسٹری وغیرہ سے فارغ ہونے دو... پھر اسے یہ بات بتا دیں گے۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

اس کے بعد وہ گھر کی طرف روانہ ہوئے... دروازے پر دستک کے جواب میں بیگم جمشید نے دروازہ کھولا... اور بولیں:

”السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔“

”وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ...“

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے... آپ لوگ آگئے...“

”اور دیکھو بیگم... ہم نے آج کے دن ہی واپس آنے کا وعدہ کیا تھا۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

دیکھا تھا تو بھی پولیس اسٹیشن والوں نے اُسے اطلاع دی ہوگی۔“
خان رحمان نے کہا۔

”یہ ہمارا خیال ہے... ہو سکتا ہے... پولیس اسٹیشن والوں
نے اس تصویر کو سرخاب کی تصویر نہ خیال کیا ہو...“ خان رحمان نے
خیال ظاہر کیا۔

”بہر حال! اس معاملے میں کوئی چکر ضرور ہے... اور اس
کی وضاحت داراب خان کر ہی دیں گے۔ آج ہم بہت جھگے ہوئے
ہیں... آٹھ دن مسلسل سیر کر کے لوٹے ہیں، اس لیے ایک دو دن بعد
اُس سے ملاقات کریں گے... وہ اُس وقت تک رجسٹری سے بھی
قاریغ ہو چکا ہوگا...“

”مجھے تو جشید... اس معاملے میں یہ بات نظر آتی ہے کہ بڑا
بھائی چھوٹے بھائی کی کسی زیادتی سے بیزار ہو کر وہاں سے چلا آیا،
لیکن شہر میں وہ بڑی صحبت میں پڑ گیا... اپنے بھائی سے وہ اپنا حصہ
لے کر آیا نہیں ہوگا... بس ایسا آدمی غلط صحبت میں بہت جلدی پڑتا
ہے... اور ایک دن جرائم کی دنیا میں اُسے موت کو گلے لگانا پڑا... یہ
ہے کل کہانی۔“ یہاں تک کہ کردہ خاموش ہو گئے۔

”آپ کا خیال کافی حد تک درست لگتا ہے... حرید
معلومات ہم داراب خان سے حاصل کریں گے۔“ انسپکٹر جشید نے

سے دیکھنے کے بعد انسپکٹر جشید کی آواز ابھری:

”اب میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ اُسی شخص کی تصویر
ہے... جس کی تصویر ہم نے داراب خان کے ڈرائنگ روم میں دیکھی
ہے... جس کے بارے میں اُس کا کہنا ہے کہ وہ اس کے بڑے بھائی
کی تصویر ہے۔“

انہوں نے خبر پڑھی... وہ یہ تھی:

”آج صبح سویرے سیرگاہ کے راستے پر سڑک سے نیچے ایک
لاش پڑی ملی ہے۔ بعد میں جب ماہرین نے اُس کا بغور معائنہ کیا تو پتا
چلا کہ لاش ایک جرائم پیشہ شخص سرخاب کی ہے، پولیس کافی مدت سے سرخاب
کی تلاش میں تھی، لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہو سکی تھی... پولیس اس
سلسلے میں تحقیقات کر رہی ہے، عام خیال یہ ہے کہ اس شخص نے چونکہ
لوگوں کی زندگی اجیرن بنا رکھی تھی... اس لیے ایسے ہی کسی شخص نے
موقع پا کر اسے ٹھکانے لگا دیا... حرید تحقیقات جاری ہیں...“

اس خبر کے علاوہ انہیں اور کوئی خبر کی اخبار میں نظر نہ

آئی:

”حیرت ہے... آخر اس بات کا پتا داراب خان کو کیوں
نہیں لگا... جب کہ اخبار میں خبر بھی لگ گئی تھی اور اُس نے پولیس
اسٹیشن میں رپورٹ بھی درج کرادی تھی... چلو اُس نے اگر اخبار نہیں

کے سامنے رکھ دیا... انہوں نے اس رپورٹ کا مطالعہ کیا... رپورٹ میں کوئی خاص بات نہیں تھی... بس اتنا لکھا تھا کہ میرے بڑے بھائی کئی روز سے گم ہیں... انہیں ہر طرف تلاش کیا گیا، لیکن ان کا کوئی پتا نہیں چلا... لہذا رپورٹ درج کریں... اور مناسب کارروائی عمل میں لائیں... اور بس۔“

اُس کے بعد اس رپورٹ پر آگے کوئی کارروائی نہیں لکھی گئی تھی، گویا بے چارے سرخاب خان کو تلاش کرنے کی زحمت کی ہی نہیں گئی تھی... دوسری طرف کچھ مدت بعد جب سرخاب خان کی لاش ملی تو کسی کو پتا نہ چلا کہ یہ سرخاب خان ہے... بلکہ اس وقت تو وہ سرخابن چکا تھا... ایک جرائم پیشہ کی لاش کی طرف کون توجہ دیتا... بس اسے دفن دیا گیا... اس طرح بے چارے داراب خان کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اُس کا بڑا بھائی اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہے۔“

”ہاں! کہانی یہی لگتی ہے... اس کی تصدیق داراب خان سے ہو جائے گی... مطلب یہ ہوا کہ یہ کیس شروع ہوتے ہوتے رہ گیا... ہم بال بال بچے... کیس ختم ہوا۔“

”چلیے چھٹی ہوئی... اس مرتبہ کی سیر بھی مبارک ثابت ہوئی...“ فاروق نے خوش ہو کر کہا۔

دو دن بعد خان رحمان نے اپنے وکیل سے رابطہ کیا...

کہا۔

”بلکہ اس سے پہلے ہم پولیس اسٹیشن کاشی بن سے کیوں نہ معلومات حاصل کریں... یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ رپورٹ کیا درج کرائی گئی تھی... اور لاش ملنے پر داراب خان کو اطلاع دی گئی تھی یا نہیں...“

”ٹھیک ہے... کل پولیس اسٹیشن چلیں گے۔ اب آرام کر لیا جائے۔“ انہوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

دوسرے دن وہ دوپہر سے پہلے پولیس اسٹیشن کاشی بن پہنچ گئے... انچارج کا نام فرخ شاہ تھا... اس نے اُن کا گرم جوش سے استقبال کیا:

”آپ مجھے بلا لیتے... خود کیوں زحمت کی ہے۔“

”نہیں جناب! ہمیں کام تھا... ہمیں ہی آنا چاہیے تھا...“

اب سنے... آج سے دس سال پہلے ایک شخص داراب خان شمشیر نے اپنے بڑے بھائی کی گم شدگی کی رپورٹ درج کرائی تھی... ہم دیکھنا چاہتے ہیں، وہ رپورٹ کیا تھی اور اس پر کیا کارروائی ہوئی تھی۔“

”جی اچھا... ابھی نکالے دیتا ہوں... بس آپ تاریخ بتا دیں۔“

انہوں نے تاریخ بتا دی... اس نے رجسٹر نکالوا کر ان

”بس تو پھر میں پروفیسر صاحب کو لے کر آتا ہوں... تم تیار ملنا۔“

”فکر نہ کرو۔“

آدھ گھنٹے بعد دونوں پہنچ گئے اور وہ داراب خان کے نئے پتے کی طرف روانہ ہوئے... جونہی وہ 28 نیو ماڈل ٹاؤن پر پہنچے... انہیں حیرت کا ایک جھٹکا لگا... دونوں دیہاتی بالکل اسی طرح اس دروازے پر بھی موجود تھے... جس طرح وہ انہیں حویلی کے دروازے پر نظر آئے:

وہ انہیں دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے... پھر اُن میں سے ایک اندر چلا گیا... یہ مکان چھوٹا سا تھا... اور شاید بہت کم کرائے کا تھا... انہیں یہ دیکھ کر بھی کافی حیرت ہوئی... کیونکہ ایک کروڑ کی جائیداد فروخت کرنے والے شخص کا اتنا چھوٹا سا مکان کرائے پر لینا بہت عجیب بات تھی۔

جلد ہی دروازہ کھولا گیا اور داراب خان شمشیر کی صورت دکھائی دی۔ وہ برسوں کا بیمار نظر آ رہا تھا... تین دن پہلے تو اس کا چہرہ اس حد تک اُترا ہوا نہیں تھا... ہاں پریشان اُس وقت بھی تھا:

”میں نے زمین کے کاغذات آپ کے وکیل کو دے دیے

اس نے بتایا کہ رجسٹری ہو چکی ہے... اور رقم ادا کر دی گئی ہے... خان رحمان نے یہ اطلاع انسپکٹر جمشید کو دی تو انہوں نے فوراً کہا:

”بس تو پھر... آپ دونوں جائیں... ہم ذرا داراب خان سے بھی ایک ملاقات کر ہی لیں۔“

”لیکن جمشید... اب اس کیس میں رہ کیا گیا ہے... یہ تو اپنی موت آپ مر چکا ہے۔“ خان رحمان نے غصے سے کہا۔

”ہاں! بات یہی ہے... لیکن ایک بات مجھے قدرے پریشان کر رہی ہے۔“

”اور وہ کیا جمشید۔“

”جب میں نے داراب خان کو بتایا تھا کہ میں نے اس تصویر والے شخص کو کہیں دیکھا ہے... تو اسے پہری بات سن کر صرف حیرت ہوئی تھی... جب کہ یہ سن کر تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔“

”خیر... میرے خیال میں تو یہ کوئی خاص بات نہیں... ظاہر ہے... بھائی کے ملنے پر اسے نصف جائیداد سے دینا پڑے گی... اس لیے اس کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر نہیں آئے۔“

”ہاں خان رحمان... لیکن پھر بھی میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”ہاں بالکل...“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
”بھلا وہ کیسے؟“

”آپ کے بھائی دس سال پہلے غائب ہو گئے تھے... پھر ایک شخص کی لاش پولیس کو ملی... لاش کا چہرہ بالکل آپ کے بھائی جیسا تھا۔“

”نہیں! وہ میرے بھائی کا نہیں تھا... میں نے اخبارات میں وہ تصویر دیکھی تھی۔“ اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔
”کیا آپ نے لاش کو دیکھا تھا۔“

”نہیں! میں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی... آخر آپ ایسے سوالات کیوں کر رہے ہیں... کیا آپ کا تعلق پولیس سے ہے۔“

”یہی بات ہے۔“ قاروق مسکرایا۔

”اوہ... اچھا... اب سمجھا... لیکن کیا پولیس میں ملازمت کرنے والے آج کل اتنے مال دار ہو گئے ہیں کہ ایک کروڑ کی جائیداد خرید سکیں۔“

”یہ میرے دوست ہیں... یہ پولیس میں ملازم نہیں ہیں... ہیروں اور سونے کی کانوں کی تجارت کرتے ہیں۔“ انہوں نے بتایا۔

”ہیں... سارا کام ختم ہو چکا ہے... کیا آپ کے وکیل نے آپ کو بتایا نہیں۔“

”بالکل بتایا ہے۔“ خان رحمان مسکرائے۔

”تب پھر آپ میرے پاس کس لیے آئے ہیں۔“ اس نے بڑا سامنے بتایا۔

”آپ کے اس سوال کا جواب میرے یہ ساتھی دیں گے۔“ انہوں نے انسپکٹر جمشید کی طرف اشارہ کیا۔

”ہم آپ سے کچھ باتیں کرنے کے لیے آئے ہیں... اور وہ باتیں ہیں آپ کے بھائی سرخاب خان کے بارے میں۔“
”جی... کیا مطلب؟“ وہ دھک سے رہ گیا۔

”جی ہاں! کیا آپ ہمیں اندر چل کر بیٹھنے کے لیے نہیں کہیں گے۔“

”اوہ ضرور... کیوں نہیں۔“

وہ انہیں ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں لے آیا:

”ہم اس بات پر بہت حیران ہیں کہ آپ نے یہ چھوٹا سا مکان کرایے پر کیوں لیا... جب کہ آپ ایک کروڑ کے مالک ہیں۔“
”یہ سوال ذاتی نوعیت کا ہے... کیا آپ ذاتی سوالات کرنے کا حق رکھتے ہیں۔“

”تب پھر سن لیں... کوئی نامعلوم شخص مجھے بلیک میل کر رہا

”ہے۔“

”کیا!!!“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

☆☆☆☆☆

”اوہ اچھا... خیر... میں نے لاش نہیں دیکھی تھی... تصویر

دیکھ کر جان لیا تھا کہ وہ میرا بھائی نہیں ہے۔“

”اچھا ایک بات بتا دیں، آپ نے ایک کروڑ کس بینک

میں جمع کرائے ہیں۔“

”آپ کا ہر سوال ذاتی نوعیت کا ہے... مجھے افسوس ہے...“

میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔“

”اگر میں چاہوں تو آپ سے اس سوال کا جواب لے سکتا

ہوں... اور چاہوں تو سوال کیے بغیر یہ معلوم کر سکتا ہوں کہ آپ نے

رقم کون سے بینک میں جمع کرائی ہے۔“

”آخر آپ لوگ چاہتے کیا ہیں۔“

”ہم محسوس کر رہے ہیں... آپ کے بھائی کے معاملے میں

کہیں نہ کہیں... کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔“

”اللہ اپنا رحم کرے...“ وہ بڑبڑایا۔

”اور آپ کے حق میں بہتر یہ ہے کہ جو کچھ ہمیں بتا سکتے ہیں،

سچ بتا دیں... اس صورت میں ہم آپ کے کام آنے کی کوشش

کریں گے۔“

”کک... کیا واقعی۔“ اس نے بے یقینی کے عالم میں کہا۔

”آپ تجربہ تو کریں۔“

”آپ اس کی باتوں پر نہ جائیں... اور ہمیں بتائیں...
آخر وہ نامعلوم شخص آپ کو... م... مگر نہیں... پہلے تو یہ بتائیں...
اس کا آخری مطالبہ کیا تھا۔“

”یہ کہ زمین اور حویلی بیچ کر اس کی رقم اس کے حوالے کر
دوں۔“

”اوہ... تو آپ نے وہ تمام رقم اسے دے دی... جو مجھ
سے وصول کی۔“ خان رحمان مارے حیرت کے بولے۔

”جی ہاں! یہی بات ہے۔“
”لیکن کیسے... اتنی بڑی رقم آپ نے کیسے دے دی۔“
”آپ سے مجھے چیک ملا تھا، میں نے وہ چیک ہی اسے
دے دیا۔“

”اوہ... خیر... اس کا سراغ ہم لگالیں گے کہ وہ کس نے
کیش کرایا ہے... یا اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرایا ہے... آپ صرف
یہ بتادیں... آخر وہ آپ کو کس بات پر بلیک میل کرتا رہا ہے۔“

”اس نے مجھے اپنے آدمیوں کے ذریعے اغوا کرایا تھا... وہ
مجھے ایک جنگل میں لے گئے... گاڑی بند تھی... اس لیے مجھے نہیں
معلوم کہ وہ کون سا جنگل تھا... وہاں مجھے گاڑی سے اتار دیا گیا۔ پھر
مجھ پر پستول تان دیے گئے اور کہا گیا... زمین پر ایک خنجر پڑا ہے،

آخری مطالبہ؟

چند لمحے خاموشی کے عالم میں گزر گئے... پھر محمود کے

منہ سے نکلا:

”یہ آپ نے کیا کہا ہے... کوئی آپ کو بلیک میل کر رہا
ہے۔“

”ہاں! یہی بات ہے... اس نے مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج
کر دیا ہے... تمام دولت حاصل کرنے کے بعد اس نے کہا تھا
... اب میرا آخری مطالبہ پورا کرو۔“

”لگ... کیا... آخری مطالبہ؟“ فاروق چونک کر بولا۔
”ہاں! یہی کہا تھا... کیوں... کیا بات ہے، آپ اس
طرح کیوں چونکے۔“

”میرا مطلب ہے، یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے...“
فاروق نے فوراً کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔“

وصیت کر گیا تھا کہ یہ دونوں ہر حالت میں میرا ساتھ نہیں چھوڑیں گے... بس یہ اس وقت سے غلاموں کی طرح میرے ساتھ رہے ہیں۔“

”کیا یہ ان کے ساتھ قلم نہیں۔“

”میں نے انہیں بہت مرتبہ کہا ہے کہ تم لوگ آزاد ہو... جہاں چاہو، جاسکتے ہو یہ سن کر یہ رونے لگتے ہیں... ان حالات میں میں کیا کر سکتا ہوں... اب جب کہ میں کنگال ہو گیا ہوں... تو اب بھی یہ کہیں جانے کے لیے تیار نہیں، کہتے ہیں... خوشحالی کے دنوں میں آپ کے ساتھ رہے ہیں تو تنگ دستی میں کیوں ساتھ چھوڑ جائیں۔“

”ہوں... خیر... مطلب یہ کہ اس طرح وہ شخص آپ کو کنگال کر چکا ہے۔ آپ سے بہت بڑی بھول ہوئی ہے۔“

”کیا مطلب... کیسی بھول؟“ وہ چونکا۔

”آپ کو چاہیے تھا... کسی دکیل کو یہ کہانی سنا کر مشورہ کر لیتے... وہ آپ کو بتاتے کہ اس طرح آپ پر قتل کا کیس نہیں بن سکتا... ایسی تصاویر کو اب کوئی ثبوت نہیں مانا جاسکتا... کیونکہ کمپیوٹر پر ہر قسم کی تصاویر بنائی جاسکتی ہیں۔“

”اوہ... مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔“

اسے اٹھا لو... میں اس قدر خوف زدہ تھا کہ کیا بتاؤں... ان کے حکم کی تعمیل کی... ٹھنڈا اٹھا لیا... اس کے بعد مجھ سے کہا گیا... تمیں قدم گن کر اٹھاؤ... یعنی جس طرف منہ ہے، اس طرف۔ میں نے گن کر تمیں قدم اٹھائے تو وہاں ایک شخص قتل ہوا پڑا تھا... بس اسی لمحے میری تصاویر لے لی گئیں... پھر مجھے چھوڑ دیا گیا۔ اگلے دن ہی اس منظر کی تصاویر مجھے بھجوا دی گئیں... اور...“

”ایک منٹ! تصاویر کس طرح بھجوائی گئیں۔“

”اس حویلی میں میں نگرانی کے لیے دو آدمی رکھتا تھا... کوئی نامعلوم آدمی انہیں دے گیا... یہ کہہ کر کہ داراب خان شمشیر کو دے دیں...“

”اچھا پھر۔“

”اس کے بعد پھر بلیک میلنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا... وہ موبائل پر رابطہ کرتا ہے... اور رقم وصول کر لیتا ہے۔ رقم کا چیک اس کا آدمی آکر لے جاتا رہا ہے...“

”آپ ہر وقت دو آدمی کیوں دروازے پر رکھتے ہیں... ہم نے حویلی پر بھی ان دونوں کو دیکھا تھا اور یہ یہاں بھی ہیں۔“

”ان کا باپ حویلی کا ملازم تھا... مرتے وقت وہ انہیں

”اس کیس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ لاش جو ملی تھی... یعنی داراب خان کے بھائی کی یا بھائی سے مشابہ کسی شخص... آخر اسے کس نے قتل کیا تھا اور کیوں... اس سلسلے میں آگے بڑھنے کے لیے ہمیں پھر اس تھانے کا رخ کرنا ہوگا... جس کی حدود میں لاش ملی تھی... بات دس سال پہلے کی ہے... لہذا ہمیں قائل دیکھنا ہوگی... اور اس وقت جو تھانے داروہاں لگے ہوئے تھے... ان سے بھی ملاقات کرنا ہوگی... یا تو وہ ریٹائر ہو چکے ہوں... یا پھر ملازمت میں ہوں گے... آؤ چلیں۔“

اب وہ دوبارہ متعلقہ تھانے پہنچے... تھانے کے انچارج سے دس سال پہلے کی قائل نکلوائی گئی۔ انہوں نے دیکھا، تھانے کا انچارج قائل کا سراغ لگانے میں پوری طرح ناکام رہا تھا۔ انہوں نے لاش ملنے سے لے کر کیس قائل ہونے تک کی تمام تفصیل غور سے پڑھی۔ لاش کے پاس سے سونے کی ایک زنجیر ملی تھی۔ اس زنجیر میں حرف ’Z‘ لٹکا تھا... گویا زنجیر کے مالک کا نام ’Z‘ سے شروع ہوتا تھا:

انہوں نے فوری طور پر اکرام کوفون کیا۔ اس کی آواز سنتے ہی بولے:

”اکرام... دس سال پہلے کسی جرائم پیشہ کا نام ’Z‘ سے

”خیر... آپ فکر نہ کریں... ہم اس بلیک میلر کا سراغ لگا کر رہیں گے اور آپ کی دولت آپ کے حوالے کریں گے۔“

”نہیں نہیں... اس کی ضرورت نہیں... مجھے نہیں چاہیے ایسی دولت، جو سکون لوٹ لے... چین سے سونے بھی نہ دے... جب سے یہ چکر چلا ہے... میں ایک رات بھی آرام سے نہیں سویا... اور کل رات پہلی بار مجھے نیند آئی تھی... یعنی ساری دولت دے دینے کے بعد... لہذا اب میں اس کے بغیر جینا چاہتا ہوں۔“

”خیر... یہ تو آپ کی مرضی ہے... لیکن مجرم کو سزا دلوانا قانون کا کام ہے... لہذا ہمیں تو اس بلیک میلر کو تلاش کرنا پڑے گا... نہ جانے وہ اور کتنے لوگوں کو اس طرح ستا رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے... جو آپ کا جی چاہے وہ کریں... لیکن مجھے اب اس دولت کی ضرورت نہیں۔“

”اچھی بات ہے... اب ہم چلتے ہیں۔“

وہ اٹھ کر باہر آگئے... انسپکٹر جمشید اس وقت کسی گہری سوچ میں گم نظر آ رہے تھے... انہوں نے یہ بات صاف طور پر محسوس کر لی... فرزانہ سے رہا نہ گیا... اس نے کہا:

”آپ کس سوچ میں ہیں۔“

شروع ہوتا تھا... اپنا دس سال پہلے کا ریکارڈ چیک کرلو... شاید اس کا نام معلوم ہو جائے۔“

”بہت بہتر ہے۔“

اور پھر دس منٹ بعد اکرام کا فون موصول ہوا... وہ پر جوش انداز میں کہہ رہا تھا۔

”س... بر... اس کا نام معلوم ہو گیا... اور اس کا ٹھکانہ بھی... نام زار ان ہے اور ہوٹل کا نام ڈوبے۔“

”بہت خوب اکرام... کیا اب بھی اسی ہوٹل میں رہتا ہے۔“

”یہ معلوم نہیں سر... لیکن ہوٹل کی انتظامیہ سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے۔“

”ہاں! یہ بات ٹھیک ہے... ہم ابھی وہاں جاتے ہیں۔“

”لیکن ذرا سنبھل کر سر... سنا ہے... یہ ہوٹل بہت خطرناک ہے...“

”کوئی بات نہیں... ہم دیکھ لیں گے انشا اللہ۔“

اور پھر وہ اسی وقت ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے... ہوٹل ڈوبے شہر کا بدنام ہوٹل تھا... لیکن تھا بہت بڑا... عام خیال یہ تھا کہ اس میں جرائم پیشہ لوگ رہتے ہیں... پولیس نے کئی

مجرموں کی تلاش میں کئی بار اس پر چھاپے مارے تھے۔ لیکن آج تک ایک مجرم بھی اس ہوٹل سے گرفتار نہیں کیا جاسکا تھا... ان کی گاڑی ہوٹل کے سامنے رکی تو فوراً چند پیرے ان کی طرف لپکے...“

”سامان ہے صاحب۔“

”ہم شہر میں ہی رہتے ہیں... باہر سے نہیں آئے۔“ انسپکٹر جمشید خٹک لہجے میں بولے۔

”اوہ کوئی بات نہیں... گاڑی آپ کو پارکنگ ایریا میں لگانا ہوگی... یا چابی ہمیں دے دیں... پارک کر دیتے ہیں۔“

”گاڑی ہم خود پارک کریں گے... آپ یہ بتائیں... پارکنگ ایریا ہے کس طرف۔“

”ہوٹل کے سامنے لوہے کا جھٹکا نظر آرہا ہے تا سر... بس اس میں لے جائیں۔“

”اچھی بات ہے۔“

کار پارک کر کے وہ ہوٹل میں داخل ہوئے... دروازے پر کھڑے باوردی اسٹاف نے انہیں سلام کیا:

اند ر ہال بہت وسیع تھا... ایک اسٹڈنٹ فوراً ان کی طرف لپکا:

”سر... پہلے اپنی میز کے لیے کارڈ لے لیں... اس طرح

ہمارا ضائع کر رہے ہیں... جونہی وٹران کا آرڈر لے کر آیا... انسپکٹر جمشید اس سے مخاطب ہوئے:

”کیا آپ ہماری مدد کر سکتے ہیں۔“

”فرمائیے۔“ اس نے بااخلاق لہجے میں کہا۔

”ہم آپ کی خوب خدمت کریں گے... آپ حیران رہ

جائیں گے... شرط یہ ہے کہ آپ ہماری مدد کر دیں۔“

”آپ فرمائیے... میرے بس کا کام ہوا تو میں ضرور کروں

گا۔“ اس نے کہا۔

”آپ یہاں کب سے ملازم ہیں۔“

”مدت دراز سے ملازم ہوں... اس ہوٹل میں جو آدمی ایک

بار ملازم ہو جاتا ہے... وہ ملازمت چھوڑ کر نہیں جاسکتا... مطلب یہ

کہ مگر کبھی فارغ ہوتا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونک اٹھے۔

”یہ تو آپ نے بہت حیرت انگیز بات بتائی ہے۔“

”اوہ... مم... مجھے افسوس ہے... میں نیند میں تھا

شاید... میری منہ سے کوئی غلط بات نکل گئی ہے... معافی چاہتا

ہوں۔“

”اور آپ رہتے کہاں ہیں۔“

آپ کی میز پر کوئی اور نہیں بیٹھے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“

انسٹنٹ نے ایک کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا۔ خان

رحمان اس کاؤنٹر پر پہنچے:

”میز کے لیے کارڈ۔“ وہ بولے۔

”پانچ ہزار روپے۔“

”صرف میز کے کارڈ کے؟“

”ہاں سر... آج کی تاریخ میں وہ آپ کی رہے

گی... چاہے آپ اٹھ کر چلے جائیں یا بیٹھے رہیں۔“

”اچھی بات ہے۔“

پانچ ہزار کا نوٹ دے کر وہ کارڈ لے آئے، ان کی میز

کا نمبر 13 تھا... وہ اس پر جا بیٹھے... ہال کے چاروں طرف شیشے کی

دیوار تھی... ان کی میز دیوار کے ساتھ تھی۔ اس طرح وہ باہر کا منظر بھی

دیکھ سکتے تھے... ان کے بیٹھنے کے تین منٹ بعد ان کی میز کا وٹران ان

کے پاس آکھڑا ہوا... منہ سے اس نے کچھ نہ کہا... آخر خان رحمان

نے انگلی کے اشارے سے اسے بلا یا اور کچھ چیزوں کا آرڈر

دیا... کیونکہ خالی بیٹھے ہوئے لوگوں کو سیکورٹی والے گھورنے لگتے

ہیں، شاید کہتے ہوں گے... یہ کھاپی تو کچھ رہے نہیں... یونہی وقت

”ہوٹل کے کچھلی طرف تمام ملازمین کے لیے کوارٹرز بنائے گئے ہیں... بس میں بھی وہی رہتا ہوں... اپنے بیوی بچوں کے ساتھ... لیکن اب آپ ایک مہربانی کریں... میرے منہ سے جو غلط بات نکل گئی ہے...“

عین اس لمحے اس کے موبائل کی گھنٹی بج اٹھی... وہ چونک گیا۔ جلدی سے موبائل جیب سے نکالا، اسکرین پر نظر ڈالتے ہی اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا:

”مم... میں مارا گیا... میرا دماغ پھر گیا تھا... میں پاگل ہو گیا... جو آپ کو یہ بات بتا بیٹھا... آج میری زندگی کا آخری دن ہے... ل... لیکن میں مرنے سے پہلے اپنے بیوی بچوں سے ملنا چاہتا ہوں... لیکن... لیکن... اب مجھے ان سے کون ملنے دے گا... موت کا پروانہ تو جاری ہو بھی چکا۔“ وہ مارے خوف کے کہتا چلا گیا۔ اور پھر اس نے موبائل آن کیا اور بولا۔

”لیس سر:

”آ جاؤ... فوراً... ورنہ انجام بھیا نک۔“ ایک بہت ہی کھروری آواز انہوں نے بھی سنی۔ فون بند کرتے وقت وہ تھر تھر کانپ رہا تھا... آخر فون بند کر کے ان سے بولا۔

”چند منٹ پہلے مجھے معلوم تک نہیں تھا کہ میری زندگی کا یہ

آخری دن ہے... آپ نے مجھے کہاں پہنچا دیا... اس نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا... پھر انسپکٹر جمشید نے کہا:

”میرے خیال میں تو آپ بلاوجہ ڈر رہے ہیں... ابھی ابھی فون کیا گیا ہے کہ آ جاؤ فوراً... ورنہ انجام بھیا نک... گویا فوری طور پر جانے کی صورت میں انجام بھیا نک نہیں ہوگا۔“

”یہ بات نہیں... بھیا نک انجام کا مطلب ہے... میرے بیوی بچوں کو میری آنکھوں کے سامنے قتل کیا جائے گا... اور اب میں رک نہیں سکتا... میری جان تو اب جائے گی... بیوی بچوں کی کیوں جائے۔“

یہ کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ایک سمت میں چلا گیا:

”آؤ بھی... جلدی کرو۔“

وہ بھی اٹھے اور اس کی طرف چلے... جلد ہی اس کے بالکل نزدیک پہنچ گئے... اس نے بھی یہ بات محسوس کر لی... مڑ کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے کہا:

”آپ... آپ کیوں میرے پیچھے آ گئے... میرے ساتھ آپ بھی کیوں اپنی موت کو آواز دیتے ہیں۔“

تو وہ وہاں میرے بیوی بچوں کو بلوالے گا۔“

دوسری طرف سلسلہ ملنے پر انہوں نے کہا:

”ہم اس وقت ہوٹل ٹو بے میں ہیں... فوری طور پر

آ جاؤ... اور خفیہ فورس کو بھی فون کر دو۔“

”جی اچھا۔“

موبائل بند کر کے انہوں نے سرد آواز میں کہا:

”ہم جو کچھ کر رہے ہیں... آپ کے لیے کر رہے

ہیں... سمجھے۔ اب چلیں... کدھر چلتا ہے۔“

”آپ میرے لیے اپنی جان کیوں مصیبت میں ڈال رہے

ہیں... اپنا کام کریں۔“

”اپنا کام ہی تو کر رہے ہیں۔“ محمود مسکرایا۔

اس نے محمود کی طرف دیکھ کر بڑا سامنے بتایا اور قدم

اٹھانے لگا... یہاں تک کہ وہ لفٹ تک پہنچ گئے۔ اس نے لفٹ کا بٹن

دبایا... لفٹ آ کر رکی... اور دروازہ کھل گیا۔ اب وہ اندر داخل

ہوئے... اس نے سب سے سے اوپر والی منزل کا بٹن دبایا... آخر

لفٹ رک گئی... اس کا دروازہ کھلا اور وہ باہر نکلے... اوپر ایک کھلی

چھت تھی... اس کے ایک طرف بڑے کمرے کا دروازہ نظر آیا...

اس کے باہر دس مسلح آدمی کھڑے تھے... فوراً ہی ان کی کلاشن کوفوں

”یہ وقت آپ پر ہماری وجہ سے آیا ہے... لہذا ہم آپ کی

مدد کریں گے۔“

”آپ مدد کریں گے... ہا ہا ہا...“ اس نے پھس پھسا

قہقہہ لگایا۔

”کیوں... کیا آپ کے خیال میں ہم مقابلہ نہیں کر سکیں

گے۔“

اس ہوٹل کے سو سے زیادہ ملازم ہیں اور وہ ہوٹل کے مالک

کے پالتو کتوں کی طرح ہیں... وہ جب انہیں اشارہ کرے گا کہ ان

لوگوں کی تھکے ہوئی کر دو... تو وہ سب کے سب آپ لوگوں پر ٹوٹ

پڑیں گے۔“

”اللہ مالک ہے... آپ چلیں... کہاں چلتا ہے۔“

”اور... اول تو آپ لوگوں کو راستے ہی میں روک لیا

جائے گا۔“

”اوہو اچھا... تب پھر آپ ذرا یہیں رک جائیں... اب

ہم ساتھ ہی چلیں گے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے بیرے کو کھلائی سے پکڑ لیا اور اکرام

کے نمبر ڈائل کیے:

”یہ... یہ آپ کیا کر رہے ہیں... اگر میں یہاں لیٹ ہو گیا

کے رخ ان کی طرف اٹھ گئے۔ ان میں سے ایک کی آواز ابھری:
 ”تم لوگ رانو کو چھوڑ دو... ورنہ سب کے سب بھون
 ڈالے جاؤ گے۔“

میرا

☆☆☆☆☆

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا... دوسری
 طرف رانو کا حال بہت پتلا تھا... انپکڑ جمشید محسوس کر رہے تھے کہ
 جونہی انہوں نے اس کی کلائی کو چھوڑا... وہ گر جائے گا:

”تم لوگوں نے سنا... یہ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”جی ہاں! یہ کہہ رہے ہیں کہ رانو کو چھوڑ دو۔“

”پروفیسر صاحب! آپ نے بھی سنا۔“

”ہاں ہاں جمشید... سنا تو میں نے بھی ہے...“

”تو کیا خیال ہے... ہم رانو کو چھوڑ دیں۔“

”نن جمشید... اس طرح تو بے چارہ مارا جائے گا۔“

”تو پھر آپ انہیں بتا دیں نا۔“

”کک... کیا... کیا بتا دوں۔“

”یہی کہ... ہم رانو کو نہیں چھوڑیں گے... میرا مطلب

ہے، ہم اس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے... اس کے ساتھ جو سلوک کرنا

ہے... ہمارے سامنے کرو۔“

”اچھی بات ہے، سنو بھی... ہم رانو کو نہیں چھوڑیں گے،

میرا مطلب ہے، ہم اس کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔“

”خاموش... یہ کیا ٹرٹل گار کھی ہے...“ دروازے پر موجود

مسلح افراد میں سے ایک نے جھلا کر کہا۔

”آپ رہنے دیں اگل... آپ کی باتیں انہیں پسند نہیں

آ رہیں... اب ہم شروع کرتے ہیں، ان سے بات چیت...

سنو دوستو! دو+دو چار۔“ فاروق بولا۔

”یہ کیا بات ہوئی دو+دو چار۔“

”اچھا آپ کے خیال میں یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی... خیر تو

پھر اب یہ بات سن لو... ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔“

”حد ہو گئی...“ دوسرا چلایا۔

”واقعی... اس میں کوئی شک نہیں۔“ خان رحمان نے خوش

ہو کر کہا۔

”کک... کس میں خان رحمان۔“ پروفیسر داؤد نے

حیران ہو کر کہا۔

”یہ کہ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا میں کوئی شک نہیں۔“

”یہ لوگ پاگل کتے ہیں... باس ہماری کھال گرا دیں

گے... انہوں نے کہا تھا... رانو کو فوراً اندر بھیجو۔“

رانو اندر جانے کے لیے تیار تو ہے... آپ لوگ خود

نہیں جانے دے رہے...“

ایسے میں دروازے پر لگے پیکر سے آواز ابھری:

”کیا بات ہے... اتنی دیر۔“

”باس! کچھ لوگ رانو کو پکڑے کھڑے ہیں... وہ اس کے

ساتھ اندر آنا چاہتے ہیں۔“

”یہ کون لوگ ہیں۔“

”باس! ہم نہیں جانتے... ہال سے اس کے ساتھ ہی اوپر

آئے ہیں... اور اس کے ہمدرد بن رہے ہیں۔“

”آہا... تب تو ٹھیک ہے... انہیں بھی ساتھ ہی بھیج دو۔“

”لو بھیج... اب تو اجازت ہو گئی۔“ فاروق نے خوش ہو کر

کہا۔

”تم لوگ خوش ہو رہے ہو... حالانکہ اس کے ساتھ خود تم

بھی موت کے منہ میں جا رہے ہو۔“

”چلو کوئی بات نہیں... ہائیں... کیا کہا... موت کے منہ

میں ارے باپ رے... یار جشید چلو... واپس چلتے ہیں۔“ پروفیسر

داؤد کانپ کر بولے۔

”واپس چلیں گے... ان کے باس سے ملاقات کے بعد...
 بہت دلچسپی محسوس ہو رہی ہے... ذرا غور تو کریں پروفیسر صاحب...
 ہر بیرے کی بات یہ شخص اپنے کمرے میں سن رہا ہے... اور اسی بنیاد پر
 اس نے رانو بیرے کو اوپر بلایا ہے... تاکہ سزا دے سکے...
 آؤ...“ یہ کہہ کر انسپکٹر جمشید آگے بڑھے... سب ان کے ساتھ
 چلے... ادھر ان لوگوں نے دروازہ کھول دیا... جب وہ اندر جانے
 لگے تو ان میں سے ایک نے کہا:

”بے چاروں کو آخری بار دیکھ رہے ہیں۔“

”ہائیں... کیا آپ لوگوں کا مرنے کا پروگرام ہے۔“

فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”ہمارا نہیں... تم لوگوں کا۔“

”آؤ بھی... دیر نہ کرو... بے چارے باس کا پارہ چڑھ

جائے گا۔“

اور وہ سب اندر داخل ہو گئے... ساتھ ہی دروازہ بند
 ہو گیا... انہوں نے دروازے میں چابی گھومنے کی آواز بھی
 سنی... گویا دروازے کو تالا لگا دیا گیا تھا... دوسری طرف انہوں نے
 دیکھا، کمرے میں کوئی نہیں تھا:

”یہ... یہ کیا... یہاں تو باس نہ باس زاد۔“ فاروق نے

بلند آواز میں کہا۔

”یہ کیا بات ہوئی... باس نہ باس زاد۔“ فرزانہ نے منہ

بتایا۔

”شاید... تم نے شاید پرانے زمانے کی جادوئی کہانیاں

نہیں پڑھیں۔“

”بالکل نہیں... اس دور میں ان کہانیوں کا کیا ذکر۔“

”ان کہانیوں میں یہ جملہ بولا جاتا تھا... وہاں نہ کوئی آدم

تھا نہ آدم زاد۔“

”دھت تیرے کی۔“ محمود نے جھلا کر ہاتھ نچایا۔

”ہاں تو کیا کہا تھا تم نے ان لوگوں سے۔“ کمرے میں

آواز ابھری۔

”بب... باس... غغ... غلطی ہو گئی... میں شاید نیند میں

چلا گیا تھا۔“

”ڈیوٹی کے دوران نیند۔“ غرا کر کہا گیا۔

”نن... نہیں باس... اونگھ۔“

”اونگھ بھی معاف نہیں۔“

”باس... رحم...“

”اب کہو اپنے ان ہمدردوں سے... تمہیں بچالیں...“

لو... میں تمہیں حکم دیتا ہوں... اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا خود گھونٹ لو۔“

”نن... نہیں... نہیں باس۔“

”میں نے کہا ہے... اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا خود دباؤ... پوری طاقت سے۔“

”اچھا باس۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی اس کے دونوں ہاتھ گلے کی طرف بڑھے... فوراً ہی انسپکٹر جمشید حرکت میں آ گئے... انہوں نے اس کے دونوں بازو کلائی پر سے پکڑ لیے... ادھر وہ زور لگانے لگا ہاتھوں کو گلے تک لے جانے کے لیے... ادھر انسپکٹر جمشید اس کے دونوں ہاتھوں کو گلے سے دور رکھنے کے لیے زور لگانے لگے... انہیں حیرت بھی ہو رہی تھی... کہ اس میں اتنا زور کہاں سے آ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ دور رکھنے کے سلسلے میں انہیں پورا زور صرف کرنا پڑ گیا... اس وقت اس کیفیت کو خان رحمان نے بھانپ لیا... وہ فوراً آگے بڑھے اور اس کا ایک ہاتھ انہوں نے قابو میں کر لیا... وہ دونوں ہاتھوں سے پکڑ چکے تھے... یہ دیکھ کر انسپکٹر جمشید نے اس ہاتھ سے اپنا ہاتھ لیا... اور دونوں ہاتھ اس کی ایک کلائی پر جما دیے... جونہی یہ کیا گیا... خان رحمان کو ایک زور دار جھٹکا لگا... وہ دور جا

گرے... اب رانو کا ایک ہاتھ گلے کی طرف بڑھا... اور اس پر جم گیا... دوسرا ہاتھ اب تک انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں تھا... اور وہ ان سے اپنا ہاتھ نہیں چھڑا سکا تھا... اس لمحے انہوں نے محسوس کیا... اس کا ایک ہاتھ اپنی شررگ پر جم چکا تھا... اور وہ اس قابل تھا کہ ایک ہاتھ سے بھی گلا دبا سکے... یہ محسوس کرتے ہی انسپکٹر جمشید پریشان ہو گئے... انہوں نے ایک ہاتھ کلائی پر سے ہٹا لیا اور اسے دوسرے ہاتھ کی کلائی پر جما کر زور لگانے لگے... وہ سمجھ چکے تھے کہ رانو میں ذاتی طور پر اتنی طاقت نہیں تھی... اس وقت تو وہ قوت کام کر رہی تھی جس نے اسے حکم دیا تھا... اور شاید یہ پٹنا ٹرم کی حالت تھی... زور لگانے کے دوران اچانک انہیں خیال آیا... وہ چلائے:

”پروفیسر صاحب... اسے بے ہوشی کی دوا سنگھادیں۔“

یہ صورت حال دیکھ کر وہ تینوں آگے بڑھے اور دوسری کلائی قابو میں کر کے زور لگانے لگے... انسپکٹر جمشید نے پھر اس کلائی پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ لیکن ایسا کرتے ہی ان تینوں کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ اچھل کر دیوار سے جا ٹکرائے... وہاں پہلے خان رحمان موجود تھے... انہیں بھی اپنی طرح گرتے دیکھ کر مسکرائے اور بولے:

”خوش آمدید۔“

”مذاق اڑا رہے ہیں انکل۔“ فاروق نے ہنس کر کہا۔

”میں خود اس انداز میں دیوار سے ٹکرایا ہوں، لہذا مذاق کیسے اڑا سکتا ہوں... میں تو اس بات پر خوش ہو رہا ہوں کہ ہم سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔“

”ارے باپ رے۔“ ایسے میں فرزانہ کی خوف میں ڈوبی آواز سنائی دی۔

انہوں نے چونک کر دوسری طرف دیکھا... انسپکٹر جمشید کافی مشکل میں نظر آئے... عین اس لمحے پروفیسر نے اس کی ٹاک پر رومال رکھ دیا... ایسا کرتے ہی اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے پڑ گئے اور وہ گرنا چلا گیا... انسپکٹر جمشید نے اسے آہستہ سے فرش پر لٹا دیا:

”آف مالک! یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔“

”لیکن ابا جان! آخر اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی۔“

”یہ پیناٹوم کے دوران دیے گئے حکم کی وجہ سے اتنا طاقت ور ہو گیا تھا... پہلے ہی ٹرانس میں لایا ہوا تھا... اور اس میں ہدایت بھی دی گئی ہوگی کہ ہوش کی حالت میں بھی باس جو حکم دے گا، اس پر عمل کرو گے...“ انہوں نے وضاحت کی۔

”لیکن سوال یہ ہے کہ اس کمرے کا تو کوئی دوسرا دروازہ بھی نہیں ہے... تو پھر باس کہاں ہے۔“

”میں تم لوگوں سے دور نہیں ہوں... تمہیں حرا چکھانے

کے لیے تمہارے سر پر موجود ہوں... رانا اپنا گلا خود نہیں کھونٹ سکا تو کیا... اب تمہارے ساتھ سک سک کر مرے گا... یہ لو... مزہ چکھو اپنی سرکشی کا۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی ان کے پیردوں تلے سے زمین

کل گئی۔

o

انہیں یوں لگا جیسے کسی گہرے کنویں میں گرتے چلے جا رہے ہوں، تاریکی بھی حد درجے تھی... آخر وہ دھم دھم کر کے نیچے جا کرے... وہ کسی نرم چیز پر گرے تھے۔ ساتھ ہی باس کی آواز ابھری:

”اب زندگی کے دن یہاں گزارو... بھوکے پیاسے... سک سک کر اور تڑپ تڑپ کر... میں نے تمہیں ہال میں پہچان لیا تھا... تم ملک کے مشہور و معروف سراغرساں انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی ہو... یہی بات ہے نا... اور ملک کے لیے ہی نہیں... تم تو دنیا بھر میں معروف ہو... اور گمنامی کی موت مر رہے ہو... اس کنویں میں کچھ اور لوگ بھی ہیں... ان میں کچھ زندہ ہوں گے... کچھ مرنے

وہاں تو گھٹ جاتا ہمارا دم۔“
 ”فکر نہ کرو... اس جگہ سے تمہیں کسی بھی وقت اس کنویں کی
 تہ میں پہنچایا جاسکتا ہے۔“
 ”ارے باپ رے۔“ وہ ایک ساتھ بولے۔

☆☆☆☆☆

کے قریب ہوں گے اور کچھ مر کر بھی گل سڑ چکے ہوں گے...
 ان الفاظ کے ساتھ ہی انہیں شدید ترین بدبو کا احساس
 ہوا... اس وقت تک وہ اوپر سے نیچے گرنے کی وجہ سے دھیان نہیں
 دے پائے تھے... اب اس کے ذکر کرنے پر یہ ان کے حواس پر چھا
 گئی... انہیں یوں محسوس ہوا جیسے وہ اسی وقت بے ہوش ہو جائیں
 گے... اور پھر وہ بے ہوش ہو ہی گئے... اسی وقت ایک آواز ابھری:
 ”ان لوگوں کو بھی یہاں سے گھسیٹ کر کنویں کے تہ خانے
 میں پہنچادو... تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بچے بانسری...“

o

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
 www.pdfbooksfree.pk

انہیں ہوش آیا تو وہ ایک بہت لمبے کمرے کے فرش پر
 لیٹے ہوئے تھے... انہوں نے دائیں بائیں گردنیں گھما کر ایک
 دوسرے کو دیکھا... انہیں قریب ہی رانو بھی نظر آیا... ان کے اور رانو
 کے علاوہ وہاں کچھ اور لوگ بھی تھے... تاہم یہاں وہ بدبو نہیں تھی...
 اور اس لمبے کمرے میں روشنی اور ہوا بھی موجود تھی... یہ دیکھتے ہی وہ
 اٹھ بیٹھے... فاروق نے خوش ہو کر کہا:
 ”اللہ کا شکر ہے... ہم اس تاریک کنویں میں نہیں ہیں...“

تمہیں تلاش نہیں کر سکے گی... اب پہلے انہیں زور لگانے دو... میں پھر تم سے بات کروں گا۔“

ان الفاظ کے ساتھ ہی آواز بند ہو گئی... انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا... ایسے میں انہیں اپنے موبائلوں کا خیال آیا... لیکن پھر فوراً یہ بات یاد آ گئی کہ انہیں تو بے ہوش کر دیا گیا تھا... ظاہر ہے، اس دوران ان کی جیبوں سے تمام چیزیں نکال لی گئی ہوں گی... اس خیال کے آتے ہی انہوں نے جیبوں کی تلاشی لی... جیبوں میں واقعی کچھ نہیں تھا... ایسے میں محمود کو اپنے چاقو کا خیال آ گیا... اس نے جوتے کی ایڑی سرکا کر دیکھی... تو چاقو کو وہاں موجود پایا... گویا انہیں اس کے چاقو کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا...

اسی وقت انہوں نے ایک آواز سنی... آواز اکرام کی تھی... وہ اعلان کرنے کے انداز میں کہہ رہا تھا:

”ہوٹل کی انتظامیہ سن لے... ہوٹل کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے... ہوٹل کا کوئی ملازم اگر فرار ہونے کی کوشش کرے گا تو اسے گرفتار کر لیا جائے گا... اور ہم سب سے پہلے ہوٹل کے منجر سے ملنا چاہتے ہیں... دروازے پر کسی کو بھیج دیا جائے... ہماری ہدایات پر عمل نہ کیا گیا تو نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔“

”لو بھئی! اکرام تو پہنچ گیا... خفیہ فورس کے ارکان بھی پہنچ

نئی آمد

جلد ہی ایک آواز ابھری:

”باس! پولیس نے ہوٹل کو گھیر لیا ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا... پہلے بھی تو پولیس ہوٹل کو گھیرتی رہتی ہے

... زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ وہ ہوٹل کی تلاشی لیں گے... لینے

دو... ان لوگوں کی تو وہ گرد کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے... تم نیچے جاؤ،

بس ان سے تلاشی کے وارنٹ کا مطالعہ کرنا... اگر ان کے پاس تلاشی

کے وارنٹ ہوں... تو رکاوٹ نہ بننا... وارنٹ نہ ہوں تو کہنا کہ پہلے

وارنٹ لے آئیں... ویسے وہ وارنٹ کے بغیر تو آئے نہیں ہوں گے

بس جاؤ۔“

”او کے باس۔“

انہوں نے پھر دوڑتے قدموں کی آواز سنی... ادھر

باس پھر ان سے مخاطب ہوا... تم نے سنا... تم لوگوں کو ہوٹل سے

برآمد کرنے کے سلسلے میں پولیس آگئی ہے... لیکن تم فکر نہ کرو... وہ

”بالکل۔“ اس نے کہا۔
 ”خوب! آپ میرے ساتھ اندر تشریف لے چلیے۔“
 ”میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔۔۔ میرے ساتھ میرے دوست بھی چلیں گے۔۔۔ باقی باہر ٹھہریں گے۔۔۔ آپ کی تعریف۔“
 ”میرا نام زدار خان ہے۔۔۔ ہوٹل کا نائب منیجر ہوں۔“
 ”اور منیجر صاحب؟“

”وہ آج چھٹی پر ہیں۔۔۔ ان کی عدم موجودگی میں میں ہی منیجر ہوں۔“

”شکریہ چلیے پھر۔“ اکرام نے کہا اور محمد حسین آزاد اور توحید کو بھی ساتھ چلنے کا اشارہ کیا۔۔۔ باقی ساتھیوں کو اس نے اشارہ کیا کہ چوکس رہیں۔

ایسے میں اکرام کے دماغ میں ایک خیال نے سر ابھارا۔۔۔ خیال یہ تھا کہ جو لوگ انسپکٹر جمشید، محمود، فاروق، فرزانہ خان رحمان اور پروفیسر داؤد جیسوں کو غائب کر سکتے ہیں۔۔۔ وہ ان کی کیا دال گلنے دیں گے۔۔۔ اس خیال کا آنا تھا کہ اس نے غیر محسوس انداز میں جیب سے موبائل نکالا اور انسپکٹر کامران مرزا کے نمبر ڈائل کر ڈالا۔۔۔ فوراً ہی ان کی آواز سنائی دی:

”السلام علیکم۔۔۔ لگتا ہے۔۔۔ گڑبڑ ہے۔۔۔ صرف یہ بتا

چکے ہوں گے۔۔۔ لیکن۔“ انسپکٹر جمشید کہتے کہتے رک گئے۔
 ”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ لوگ ہم تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

”یقین سے تو خیر یہ بات نہیں کہی جاسکتی۔۔۔ اکرام بھی آخر ہمارا ساتھی ہے۔۔۔ پھر بھی میری خواہش ہے کہ اکرام انسپکٹر کامران مرزا کو بلا لے۔“

”آمین!“ انہوں نے ایک ساتھ کہا۔
 ”اور اب بیرونی آوازیں بند کر دی گئی ہیں۔۔۔ گویا ہم اب کچھ نہیں سن سکیں گے۔۔۔ تب پھر ہم آرام کیوں نہ کریں۔۔۔ آؤ سوتے ہیں۔“

انہوں نے کہا اور فرش پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔۔۔ ان کی دیکھا دیکھی۔۔۔ انہوں نے بھی آنکھیں بند کر لیں۔۔۔

o

ڈوبے ہوٹل کا صدر دروازہ کھلا اور ایک خوش لباس آدمی باہر نکلا۔۔۔ اس نے اکرام کی طرف بڑھتے ہوئے کہا:
 ”یہ اعلان آپ کی طرف سے کیا گیا ہے۔“

ویں... کہاں پہنچتا ہے۔“

”دارالحکومت کے ڈوبے ہوئے۔“

”بس فکر نہ کرو۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا...

اکرام نے وقت دیکھا... دن کے گیارہ بج رہے تھے... اور اگر انہیں فوری طور پر بھی کوئی پرواز مل جاتی تو وہ ڈیڑھ گھنٹے کے اندر یہاں پہنچ سکتے تھے... گویا انہیں تلاش کے بہانے اس جگہ ڈیڑھ گھنٹا گزارنا تھا۔

اندر شیشے کی دیواروں والے ایک کیمین کے دروازے پر رکتے ہوئے زوار خان ان کی طرف مڑا:

”یہ میرا آفس ہے... پہلے تو آپ یہاں تشریف رکھیں...

ہم دودو باتیں کر لیں... پھر جو آپ کو کرنا ہے... کر لیجئے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ اکرام یہ کہتے ہوئے دل ہی دل میں

مسکرایا... وہ تو خود یہ چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ وقت گزار دیا جائے

... تاکہ انسپکٹر کامران مرزا پہنچ جائیں... کیمین میں کرسیوں پر بیٹھ

جانے کے بعد زوار خان نے کہا:

”اب بتائیں... آپ ہوٹل کی تلاش کیوں لینا چاہتے

ہیں۔“

”ایک سرکاری محکمے کے کچھ لوگ ہوٹل میں داخل ہوئے

تھے... انہیں دو تین گھنٹے ہو گئے... وہ باہر نہیں نکلے... ان کے موبائل بھی بند ہیں... چونکہ انہیں ہوٹل سے باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا... اس لیے ہم ہوٹل کی تلاشی لیں گے۔“

”آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ انہیں باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا گیا... کیا باہر کوئی دوربین لگائے بیٹھا تھا۔“ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

”وہ اتنے چھوٹے نہیں ہیں کہ باہر دوربین لے کر بیٹھنا پڑتا...“ توحید احمد نے منہ بتایا۔

”میرا مطلب ہے آپ کو یہ بات کیسے معلوم ہو گئی۔“

”وہ اندر جانے سے پہلے اپنے کچھ ساتھیوں کو باہر چھوڑ گئے تھے... وہ براہر باہر رہے ہیں۔“

”ہوٹل سے باہر نکلتے کے کئی راستے ہیں... ہو سکتا ہے... وہ

کسی اور راستے سے نکل گئے ہوں۔“ زوار خان نے جھلا کر کہا۔

تینوں مسکرا دیے... اور مسکراتے چلے گئے... اس

پر اس کا پارہ اور چڑھ گیا:

”یہ کیا... آپ میری بات پر مسکرائے جا رہے ہیں...

آپ بات کا جواب دیں نا۔“

”آپ کا جواب ہی ایسا ہے کہ مسکراتا پڑ گیا... دیکھیے نا...

آواز سن کر اس نے کہا:
 ”سراہم نے ہوٹل ڈوبے کو پوری طرح گھیرے میں لے لیا
 ہے... ادھر انسپکٹر کا مران مرزا کو بھی فون کر دیا ہے... بہتر انداز میں
 تو وہی تلاشی لے سکیں گے... اور ہمیں ان کے آنے تک وقت بھی
 گزارنا ہے... ادھر یہ لوگ وارنٹ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔“
 ”ٹھیک ہے... میں وارنٹ بھجوا دیتا ہوں... تم اپنے طور
 پر تلاشی شروع کر دو... میں انسپکٹر کا مران مرزا سے معلوم کرتا ہوں...
 وہ کتنی دیر میں پہنچ رہے ہیں۔“
 اس نے موبائل بند کر دیا... آخر آدھ گھنٹے بعد وارنٹ
 پہنچ گئے... لیکن اکرام نے زوار جان کو نہ بلایا... وہ تو چاہتا تھا...
 انسپکٹر کا مران مرزا بھی آئی جائیں... ورنہ پھر ہوٹل کی انتظامیہ
 اعتراض کرتی کہ ابھی تو آپ لوگوں نے تلاشی لی ہے، اب پھر تلاشی
 دیں... آخر انسپکٹر کا مران مرزا وہاں پہنچ گئے... زوار جان کو بلایا
 گیا... ادھر اکرام انہیں حالات بتا چکا تھا... زوار جان نے اندر
 داخل ہو کر کہا:

”دکھائیے جناب وارنٹ۔“

اسے وارنٹ دکھا دیے گئے... اب اس نے کہا:

”ٹھیک ہے... تلاشی لے لیں۔“

جو لوگ اندر جاتے ہوئے اپنے چند ساتھیوں کو باہر چھوڑ جائیں... وہ
 چاہے ہوٹل کے کسی بھی دروازے سے نکلیں... آئیں گے تو اپنے
 ساتھیوں کے پاس... اور پھر جب کہ ان کی گاڑی بھی پارکنگ میں
 موجود ہے... تو وہ کہیں اور کیوں جانے لگے...“

”اوہ۔“ زوار جان کے منہ سے نکلا... آخر اس نے کہا:

”آپ کے پاس تلاشی کے وارنٹ ہیں۔“

”تلاشی کے وارنٹ حاصل کرنے میں کیا دیر لگتی ہے...“

لیکن آپ کے لیے بہتر یہ ہوگا کہ وارنٹ بغیر ہمیں تلاشی لینے دیں۔“

”ہرگز نہیں... جب تک آپ وارنٹ نہیں لائیں گے...“

تلاشی نہیں لینے دی جائے گی۔“

”اچھی بات ہے... ہمیں منگا لیتے ہیں... ان کے لیے

کہیں جانے کی ضرورت نہیں...“

”اچھی بات ہے، آپ یہاں وارنٹ منگوائیں... میں ہوٹل

کے کام کر لوں... جب وارنٹ آجائیں بتا دیں، دروازے پر موجود

چہرہ اسی سے کہہ دیجیے گا، یہ مجھے بلا لیں گے۔“

”اچھی بات ہے۔“ اکرام نے کہا اور وہ بڑے بڑے منہ

بنا تا چلا گیا۔

اب اکرام نے آئی جی صاحب کے نمبر ملایا... ان کی

”ہمیں پہلے ہوٹل کے مالک سے ملوانیں۔“
 ”وہ ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں۔“
 ”ان کے بعد یہاں کے ذمے دار۔“
 ”آج تو پھر میں ہی ہوں... کیونکہ منیجر صاحب چھٹی پر ہیں۔“

”خوب! بیروں کا رجسٹر لے آئیں۔“
 ”بیروں کا رجسٹر... اس کا آپ کیا کریں گے۔“
 ”آپ سے جو کہا ہے... کریں۔“ انسپکٹر کامران مرزا سرد آواز میں بولے۔
 ”اچھی بات ہے۔“
 یہ کہہ کر اس نے کسی سے موبائل پر رجسٹر لانے کے لیے کہا... فوراً رجسٹر آگیا... انہوں نے ایک نظر اس پر ڈالی... پھر بولے:

”رجسٹر میں تمام بیرے حاضر ہیں... ٹھیک ہے۔“
 ”ہاں... ٹھیک ہے۔“

”آپ ان تینوں کو ساتھ لے جائیں... ہال کے

13 بیرے ہیں... تیرہ پورے کرا دیں۔“

”کیا مطلب؟“

”تیرہ بیرے پورے کرا دیں... اگر کوئی کم ہو اور کہیں گیا ہو ہے تو موبائل سے اسے ہدایات دیں کہ وہ فوراً یہاں آجائے۔“
 ”یہ ہوٹل کی تلاشی لینے کا کون سا طریقہ ہے۔“ اس نے جلد کئے انداز میں کہا۔

انسپکٹر کامران مرزا بھرپور انداز میں مسکرا دیے... پھر بولے:

”دیکھیے... ہم جانتے ہیں، ہمارے ساتھی یہاں آئے تھے... ہمیں اس میز کے بارے میں بھی معلوم ہے... جس پر وہ بیٹھے تھے... وہ میز اس وقت سے خالی پڑی ہے... کیونکہ میز آج کی تاریخ کے لیے ان کے نام رجسٹر کی جا چکی ہے... اس بات کا جواب آپ کو دینا ہے... درنہ ہم آپ کو یہاں سے اپنے دفتر لے جائیں گے۔“
 ”یہ کیا مذاق ہے۔“

”یہ مذاق نہیں... بلکہ یہ دیکھو... یہ... یہ ہے۔“
 اب ان کے ہاتھ میں پستول نظر آیا:

☆☆☆☆☆

نام کا کوئی شخص نہیں ٹھہرا ہوا... آپ رجسٹر چیک کر لیں۔“
 ”نہیں بھئی... ہم آپ سے پوچھیں گے... وہ بھی یہاں
 نہیں... حوالات لے جا کر، اکرام اسے لے چلو۔“

”کیا مطلب... آپ مجھے کس قانون کے تحت لے جانا
 چاہتے ہیں... میں نے کیا جرم کیا ہے۔“

”ہم آپ کا جرم بھی بتائیں گے... فکر نہ کریں... اور اگر
 اپنی بچت چاہتے ہیں تو پھر یہ بتادیں... وہ لوگ کہاں ہیں... جو میز
 نمبر 13 پر آ کر بیٹھے تھے۔“

”شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی آپ کو... میں ہیڈ بیرے سے بات
 کر لوں پہلے... کیا آپ مجھے ایک منٹ کی مہلت دیں گے۔“

”آپ عائب ہونے کی کوشش کریں گے... لہذا مہلت
 نہیں دی جائے گی۔ آپ ہیڈ بیرے کو یہیں بلا لیں۔“

”اچھی بات ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے موبائل نکال کر کسی کو
 ہدایات دیں... جلد ہی لمبے قد کا ایک بارعب شخص اندر داخل ہوا
 ... اس کے جسم پر دوسرے بیروں سے مختلف وردی تھی:

”یس سر!“

”تیوری... آج کی تاریخ میں میز نمبر 13 کس کے نام
 رجسٹر ہے۔“ اس نے پوچھا۔

موت کا کمرہ

کیبن میں سنسنی کی لہر دوڑ گئی... زوار جان نے پریشان
 نظروں سے ان کی طرف دیکھا... پھر بولا:

”آپ جو پوچھتا چاہیں، پوچھ لیں۔“

”ہم ہوٹل کے ایک مستقل گاہک سے بھی ملنا چاہتے ہیں۔“

”مستقل گاہک... کیا مطلب؟“

”وہ عام طور پر ہوٹل ہی میں رہتا ہے۔“

”اس کا نام بتادیں۔“

”ہاں ضرور... کیوں نہیں... اس کا نام ہے...“

زاران۔“

اس کے چہرے پر حیرت کی بجلی چمکی... لیکن پھر فوراً
 ہی اس نے خود پر قابو پا لیا... اتنی دیر میں وہ بھی بھانپ چکے تھے کہ
 اسے زاران کا نام سن کر حیرت ہوئی ہے... ادھر اس نے کہا:

”میں نے یہ نام پہلی بار سنا ہے... ہمارے ہوٹل میں اس

اب تک پارکنگ میں کھڑی ہے... لہذا ہم ہوٹل کی تلاشی لیں گے۔“
 ”آپ تلاشی لے لیں۔“ اس نے بڑا سامنہ بنایا۔
 وہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس وقت زوار جان نے
 کہا:

”لیکن ایک بات یاد رکھیے گا... اگر آپ تلاشی لینے پر بھی وہ
 لوگ نہ ملے تو کل کے اخبارات آپ کا خوب مذاق اڑائیں
 گے... میں نے تمام اخبارات کے رپورٹروں کو فون کر دیے ہیں۔“
 ”یہ آپ نے بہت اچھا کیا ہے... ہم اخبارات والوں کو
 کچھ بھی لکھنے سے نہیں روکیں گے... ویسے ایک بات آپ بھی جان
 لیں۔“ یہ کہتے ہوئے انسپکٹر کامران مرزا مسکرائے۔
 ”اور وہ کیا؟“

”یہ کہ اگر ہمارے ساتھی ہم نے یہاں سے برآمد کر لیے تو
 پھر کل کے اخبارات اس ہوٹل کے خلاف بھی بھرے پڑے ہوں
 گے۔“

”ایسا ہوگا ہی نہیں... لہذا ہمیں کیا پروا ہو سکتی ہے۔“
 زوار جان نے اور زیادہ بڑا منہ بنایا۔
 ”چلیے پھر... دیکھتے ہیں... کیا ہوتا ہے۔“ انہوں نے
 کندھے اچکائے۔

”سر! دیکھ کر بتا سکتا ہوں۔“
 ”تو ذرا جلدی دیکھ آؤ۔“ اس نے فوراً کہا۔
 ”جی نہیں!“ ایسے میں فرحت بول اٹھی۔
 ”کیا کہنا چاہتی ہیں۔“
 ”کسی بیرے کے ذریعے رجسٹر یہیں منگالیں۔“
 ”اچھا۔“ اس نے جھلا کر کہا اور کسی بیرے کو ہدایات دیں۔
 ایک بیرا جلد ہی رجسٹر اٹھائے اندر داخل ہوا... اب
 زوار جان نے تیوری سے کہا:
 ”اس میں دیکھ کر بتاؤ۔“
 اس نے رجسٹر کھولا... صرف چند سیکنڈ بعد اس نے کہا:
 ”مسٹر جمشید اینڈ کمپنی کے نام رجسٹر ہے۔“
 ”یہی ہم کہتے ہیں... ان لوگوں کو اندر آتے سب نے
 دیکھا ہے، لیکن ہوٹل سے نکلنے کسی نے نہیں دیکھا۔“ انسپکٹر کامران
 مرزا مسکرائے۔

”کسی اور دروازے سے نکل گئے ہوں گے... یا پھر ہوٹل
 ہی میں کہیں کسی سے ملنے کے لیے گئے ہوں گے...“
 ”تب پھر ان سب کے موبائل کیوں بند ہیں... کسی اور
 دروازے سے نکل گئے ہیں تو گاڑی تک کیوں نہیں پہنچے... گاڑی تو

... آپ ہوٹل کے مالک اور فیجر کے نام بتادیں۔“
 ”مالک کا نام قائم جان جاسانی ہے اور فیجر کا نام ہے نواب شاہ۔“

”خوب... پہلے ہمیں قائم خان جاسانی کے کمرے کی طرف لے چلیں۔“

”وہ سب سے اوپر والی منزل پر ہے...“ یہ کہتے ہوئے وہ قدرے مسکرایا۔ انہیں اس کی یہ ہلکی سی مسکراہٹ بہت عجیب لگی... انہوں نے بغور اس کی طرف دیکھا، پھر بولے:
 ”تو پھر چلیں لفٹ کی طرف“

لفٹ کے ذریعے وہ اوپر آئے... اب وہ جاسانی کے کمرے کے سامنے تھے:
 ”تالا آپ کھول دیں تو بہتر رہے گا... ورنہ ہم تو پھر کھول ہی لیں گے۔“

”آپ خود کھولیں۔“

”اچھی بات ہے۔“

انہوں نے ماسٹر چابی سے صرف چند سیکنڈ میں تالا کھول لیا۔ یہ دیکھ کر زوار جان حیران رہ گیا:

”کیوں... حیران کیوں ہوئے۔“

اور پھر تلاشی کا عمل شروع ہوا... انہوں نے مسافروں کے کمروں کی طرف رخ بھی نہیں کیا... سب سے پہلے ہوٹل مالک کا کمرہ دیکھنے کی خواہش کی... اور فیجر کا بھی۔ زوار جان اس کے جواب میں کہا:

”ہوٹل کے مالک کا کمرہ تو ہم نہیں دکھا سکتے... کیونکہ وہ یہاں ہیں ہی نہیں... رہے فیجر صاحب! وہ چھٹی پر ہیں... دو دن بعد آپ ان کا کمرہ بھی دیکھ لیجیے گا۔“

”جی نہیں۔“ انسپکٹر کا مران مرزا سخت لہجے میں بولے۔

”جی نہیں... کیا۔“

”ہم ابھی اور اسی وقت دیکھیں گے...“

”لیکن وہ تالا لگا کر گئے ہیں۔“

”ہم آپ کے سامنے تالا کھول لیتے ہیں... تلاشی بھی آپ کے سامنے لے لیتے ہیں... آپ ان سے موبائل پر بات کر لیں۔“
 ”ان کے موبائل بند ہیں۔“

”گویا آپ ان کے کمرے نہیں دکھائیں گے۔“

”مجھے اجازت نہیں... آپ اپنی ذمہ داری پر دیکھنا چاہیں تو دیکھ لیں۔“

”ہاں! کیوں نہیں... ہم اپنی ذمہ داری پر ہی دیکھیں گے

”نہیں!!!“

وہ بہت زور سے چیخ پڑا... ان کی حیرت کا کیا پوچھنا۔ آخر انہوں نے اسے فرش پر اتار دیا... اور بولے:

”آخر بات کیا ہے... آپ اس قدر خوف زدہ کیوں ہو گئے... یہ ہوٹل کے مالک کا کمرہ ہے... اس میں ایسی کیا بات ہے... جلدی بتائیں... ورنہ۔“ ان کا لہجہ حد درجے سرد ہو گیا۔

”یہ... یہ موت کا کمرہ ہے۔“ اس نے بہت مشکل سے کہا۔

کیا کہا... موت کا کمرہ۔“

ان سب کے منہ سے نکلا:

☆☆☆☆☆

”جاسانی صاحب کا کہنا تھا کہ ان کے کمرے کے دروازے پر لگنا تالا ان کے علاوہ کوئی نہیں کھول سکتا...“

”خیر... اب آپ اندر چلیں۔“

”تلاشی آپ کو لینی ہے... آپ اندر جا کر تلاشی لے لیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

”نہیں... آپ ساتھ چلیں۔“

”جی نہیں... میں نہیں جاؤں گا... ورنہ آپ کوئی الزام لگا دیں گے۔“

انہوں نے اچانک اسے بازو سے پکڑ لیا اور دروازے کی طرف بڑھے:

”یہ... یہ کیا کر رہے ہیں۔“ وہ مارے خوف کے چلا اٹھا۔

انسپکٹر کا مران مرزارک گئے:

”کیا بات ہے... آپ کے چہرے پر اتنا خوف کیوں آگیا۔“

”نن نہیں... مم... میں اندر نہیں جاؤں گا۔“

اب انہوں نے اسے دونوں ہاتھ سے پکڑا اور اوپر اٹھا

لیا:

”میں آپ کو کمرے کے فرش پر پھینکنے لگا ہوں۔“

ہیں... فرش اس وقت برابر نظر آ رہا ہے... لیکن کوئی ہلکی سی وزن والی چیز کو بھی اپنے اوپر نہیں روک سکتا۔“
 ”ہوں... لیکن نیچے گرنے والے کہاں ہیں، کس حال میں ہیں، ہم ان تک کس طرح پہنچ سکتے ہیں۔“

”آپ کا ساتھ دینے کی صورت میں باس مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا... اور نہ بتاؤں تو آپ مجھے نہیں چھوڑیں گے... لہذا پہلے یہ بتائیں... میں کیا کروں۔“

”آپ قانون کا ساتھ دیں۔“ انسپکٹر کامران مرزا بولے۔
 ”تو باس سے مجھے آپ بچائیں گے۔“

”بچانے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے... ہم اپنا کام کریں گے... آپ کا ہر طرح ساتھ دیں گے... اور قانون بھی آپ کو رعایت دے گا... آپ ہمیں فوراً اس جگہ لے چلیں... جہاں اس فرش سے نیچے گرنے کے بعد وہ لوگ پہنچے ہیں۔“

”آئے پھر... لیکن پہلے آپ مجھے لکھ کر دیں کہ آپ مجھے قانون کی گرفت سے بھی بچائیں گے اور جاسانی سے بھی۔“
 ”اچھی بات ہے...“ انہوں نے مسکرا کر کہا اور ایک کاغذ پر اسے لکھ کر دے دیا۔

”پہلیے۔“

نئی دنیا

چند لمحے سکتے کے عالم میں گزر گئے۔ آخر زوار جان نے کہا:

”جو نیکی کوئی اس کمرے کے فرش پر قدم رکھے گا... فرش میں ایک خلا نمودار ہوگا اور وہ نیچے جا گرے گا...“
 ”بہت خوب! تو ہمارے ساتھی بھی اس خلا کے ذریعے نیچے جا گرے ہیں۔“

”یہی کہا جاسکتا ہے... میں اس وقت یہاں نہیں تھا جب وہ آئے... لیکن اتنا پتا ہے... کہ وہ لوگ یہیں آئے تھے... اس وقت ہوٹل کا مالک اندر تھا... اس نے انہیں اندر بلا لیا تھا اور پھر لیور کھینچ دیا تھا... یعنی جب تک لیور نہ کھینچا جائے... وہ خلا نمودار نہیں ہوتا۔“

”تب پھر اس وقت ہمارے اندر جانے سے خلا کیسے نمودار ہو جائے گا۔“

”جاسانی صاحب جب جاتے ہیں تو لیور کھینچ کر جاتے

وہ فوراً واپس دوڑ پڑے اور اس جگہ پہنچے جہاں سے
پچھلا دروازہ کھول کر برآمدے میں داخل ہوئے تھے۔ انہوں نے
دیکھا، یہاں بھی لوہے کی دیوار ان کے استقبال کے لیے تیار کھڑی
تھی۔

”یہ کیا... یہ شخص تو ہمیں چکر دے گیا۔“

”آفتاب نے برا سامنہ بتایا۔“

”چلو کوئی بات نہیں... کبھی تم بھی اسے چکر دے

دیتا۔“ آصف مسکرایا۔

”وہ تو اس صورت میں دوں گا تا جب یہاں سے کسی طرح

بچ نکلیں گے اور اگر یہیں بھوکے پیاسے مارے گئے تو کیسے اسے چکر

دیں گے۔“

”تو یہ ہے تم سے، ان حالات میں بھی اپنی بگھارے

جار ہے ہیں۔“ فرحت جل گئی۔

”چلو! اب تم اپنے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنا لو۔“

”ادھر انسپکٹر کا مران خاموش تھے... یہ بات محسوس کر کے

وہ ان کی طرف مڑے۔“

”آپ کس سوچ میں ہیں۔“

”ہم سب کے گرد خوب سوچ سمجھ کر جال بنایا گیا ہے۔“

وہ انہیں ہوٹل کی مٹی منزل پر لے آیا... وہاں سے اس
نے پچھلے دروازے کی طرف رخ کیا۔ اس پر تالا لگا تھا... اس نے
جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا اور دروازہ کھولتے ہوئے بولا:
”آئیے۔“

انہوں نے دیکھا... وہ ایک برآمدے میں تھے...
برآمدہ گولائی لیے ہوئے تھا:

”اس برآمدے میں دائیں چلتے جائیں... آپ کی ملاقات
اپنے ساتھیوں سے ہو جائے گی... اسی راستے سے ہم واپس آ جائیں
گے.. لیکن پہلے آپ فورس کو بلا لیں۔ کیونکہ باس کچھ بھی کر سکتا
ہے۔“

”پہلے ہم اپنے ساتھیوں کے پاس جائیں گے... فورس بعد
میں بلوائیں گے۔“

”آپ کی مرضی... آئیے۔“ اس نے کہا اور وہ ان کے
آگے آگے چلنے لگا... وہ تقریباً تین منٹ تک چلتے رہے پھر اچانک
ان کے سامنے لوہے کا ایک جنگلا آگرا، لیکن اس میں سوراخ نہیں
تھے... ایک طرح سے لوہے کی چادر آگری تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے

زوار جان کا تہقہہ سنا... وہ کہہ رہا تھا۔

”کیوں... کیسا الو بتایا۔“

یہ دونوں پارٹیاں ایک دوسرے کے گلے سے لگ گئیں۔
 ”جیل خانے میں ملاقات مبارک ہو۔“ محمود کی آواز سنائی دی۔

”جج... جیل خانے میں ملاقات...“ فاروق کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔

”کک... کیا ہوا... خیر تو ہے۔“ آصف نے گھبرا کر کہا۔
 ”مم... میرا مطلب ہے... یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔“ فاروق مسکرایا۔
 ”دھت تیرے کی۔“

”چلو اچھا ہوا... خوب گزرے کی جوت بیٹھیں گے دیوانے بہت سے۔“ فرحت نے جھوم کر کہا۔
 ”لو... محاورے کی جڑ ماری دی۔“

”اوہو یہ کیا... اکرام تم بھی ساتھ ہو۔“ انسپکٹر جمشید کی آواز سنائی دی۔

”جی ہاں... جہاں آپ، وہاں میں۔“
 ”لیکن یہاں برآمدے میں وقت کیسے گزرے گا۔“
 ”ادھر آ جائیں... سب لوگ... یہ پوری ایک جیل ہے۔“
 ”کیا... کہا... جیل۔“ ان سب کے منہ سے نکلا۔

”آپ کا مطلب ہے... صرف ہم سب کے گرد یا اگل جمشید پارٹی کے گرد بھی۔“

”ہاں: ان کے گرد بھی اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے کوئی ایک دیوار ضرور اوپر اٹھ جائے گی... اس وقت تو مقصد زوار جان کو ہماری پہنچ سے دور لے جانا تھا۔“

یعنی اس لمحے انہوں نے گڑ گڑ کی آواز سنی... وہ بھاگ کر دوسرے دروازے کی طرف آئے... وہ واقعی اوپر اٹھ چکا تھا... گویا ان کے لیے راستہ صاف تھا... اب وہ اس پر چل پڑے... ابھی چند منٹ ہی چلتے ہوئے گزرے تھے... کہ کسی کے گنگٹانے کی آواز سنائی دی... آواز درد بھری تھی... اور زبان پر یہ الفاظ تھے:

انتظار نے تیرے خوب دکھایا لہرا
 صبح سے شام ہوئی، شام سے سویرا
 ”ارے... ہائیں... یہ کیا۔“ وہ ایک ساتھ چلا اٹھے۔
 فوراً ہی ایک آواز ابھری:

”تو پھر ہماری طرف سے بھی ارے ہائیں... وصول کر لیں۔“

یہ آواز فاروق کی تھی... وہ آواز کی طرف دوڑ پڑے... ادھر سے بھی دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی... اور پھر

”پہلے تو یہ بتادیں اکل... یہ لوگ کھانے پینے کو بھی دیتے ہیں یا نہیں۔“ آفتاب نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں! دو وقت کھانا دیتے ہیں۔“

”بہت اچھا سوال پوچھا آفتاب۔“ پروفیسر داؤد نے خوش ہو کر کہا۔

”ہاں اکل... ہم بہت بے چین ہیں یہ جاننے کے لیے کہ آپ آخر کس طرح پھنس گئے۔“ آصف بولا۔

”پھنس تو آپ لوگ بھی گئے ہیں۔“ فاروق نے منہ بتایا۔

”سچی بات یہی ہے کہ ہم سب اس وقت ایک ہی کشتی کے سوار ہیں... میں وضاحت کرتا ہوں... ہم لوگ وادی فرقاب کی سیر کے لیے نکلے تھے اور یہ تہیہ کر کے نکلے تھے کہ کسی کیس میں نہیں الجھیں گے... اور شاید زندگی میں پہلی بار ایسا ہوا کہ ہم سیر کے مقام تک بغیر کسی کیس میں الجھے پہنچ گئے اور واپس بھی لوٹ آئے... شہر کے کنارے پر ایک بورڈ پر لکھی تحریر نے خان رحمان کو اس وقت اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا جب ہم سیر کے لیے روانہ ہوئے تھے... وہ ایک حویلی اور ساتھ کوئی زمین کی فروخت کا بورڈ تھا... اس وقت خان رحمان نے رکنا چاہا تھا... ہم رک بھی گئے تھے... لیکن پھر خوف محسوس کر کے کہ کہیں کیس میں نہ الجھ جائیں... آگے چلے گئے

”ہاں پرائیویٹ جیل... باس کی جیل۔“ محمود نے کہا۔

”باس کی جیل... کک... کون باس۔“

”شاید ڈوبے ہوٹل کا مالک ہی اس جیل کا بھی مالک ہے... اور یہ سارا چکر اسی کا ہی چلایا ہو ہے۔“

”لیکن چکر ہے کیا۔“

”بیٹھ کر بات کرتے ہیں... آئیے۔“

چند قدم چلنے پر بائیں طرف ایک دروازہ نظر آیا... اب وہ اس دروازے میں داخل ہوئے... انہوں نے دیکھا... وہ ایک کشادہ برآمدہ تھا۔ اس کے دونوں طرف جیل نما کوٹھریاں بنی تھیں... لیکن ان کوٹھریوں پر سلاخوں والے جھگے نہیں تھے... گویا ان پر دروازے تھے ہی نہیں... یعنی بغیر دروازوں کے کوٹھریاں تھیں:

”یہاں صرف ہم ہی ہیں یا کچھ اور لوگ بھی ہیں۔“

”یہاں بہت سے اور لوگ بھی موجود ہیں...“ انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”لیکن یہ چکر کیا ہے۔“

”ہم غیر محسوس طور پر آپھنسے ہیں... آئیں... اندر بیٹھتے ہیں... میں آپ لوگوں کو تفصیل سنا تا ہوں...“

تھے... تاہم خان رحمان نے حویلی اور زمین کے مالک سے وعدہ کیا کہ واپسی پر وہ یہ خریدیں گے۔ چنانچہ ہم وہاں رکے۔ حویلی اور زمین کو دیکھا، لیکن ڈرائنگ روم میں ہمیں ایک تصویر نظر آئی۔ ہمارے پوچھنے پر حویلی کے مالک داراب خان شمشیر نے بتایا کہ یہ تصویر اس کے بڑے بھائی سرخاب خان شمشیر کی ہے جو دس سال پہلے غائب ہو گیا تھا اور آج تک لوٹ کر نہیں آیا۔ وہ تصویر مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگی... خیر خان رحمان نے وہ جائیداد وغیرہ خرید لی... داراب خان نے بتایا کہ وہ ایک کرائے کے مکان میں جا رہا ہے... ہم نے اس کا پتہ لے لیا۔ جب ہم اس سے ملے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے وہ مکان بہت چھوٹا سا اور بالکل گھٹیا تھا۔ جب کہ اس نے حویلی اور زمین ایک کروڑ کی فروخت کی تھی... اب یہ بات ہم لوگوں کے لیے حیرت کی تھی کہ ایک کروڑ کا مالک اس قدر معمولی مکان کرائے پر لے... جب ہم نے اس سے یہ کہا تو وہ پھٹ پڑا کہ کوئی اسے بلیک میل کر رہا ہے... اور یہ کہ وہ تمام رقم اس نے بلیک میلر کو دے دی ہے۔ یہ بات ہمارے لیے اور زیادہ حیرت کی تھی... ہم نے سوچا... وہ شخص نہ جانے کتنے اور لوگوں کو بلیک میل کر رہا ہوگا... کیوں نہ اس کا سراغ لگا کر لوگوں کو اس سے نجات دلائی جائے... بس ہم تو اس نیک ارادے سے اس کام پر جڑے تھے... یہ معلوم نہیں تھا کہ بلیک میلر ہمیں

بھی مٹا جائے گا... دراصل وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے... مجھے چونکہ داراب خان کی حویلی کے ڈرائنگ روم میں اس کے بھائی کی تصویر جانی پہچانی لگی تھی... اور داراب خان نے اپنے بھائی کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروائی تھی... اس لیے میں نے تھانے سے ریکارڈ نکلوایا... لیکن پولیس نے اس کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی تھی... اخبارات کی فائل سے ہمیں معلوم ہوا، انہیں دنوں ایک قتل ہوا تھا... متحول کی لاش کی تصویر داراب خان کے بھائی سرخاب خان کی تصویر سے ملتی جلتی تھی... اس لاش کے پاس سے ایک سونے کی زنجیر بھی ملی تھی۔ اس زنجیر میں انگریزی کا حرف 'Z' تھا... اکرام نے اس حرف اور تصویر کی مدد سے بتایا کہ یہ زنجیر زاران کی ہے اور زاران کا تعلق ہوٹل ڈوبے سے ہے، اس طرح ہم ہوٹل ڈوبے پہنچ گئے... یہاں ہم نے میز نمبر 13 پر کرائی، اس کے پیرے سے ہم نے زاران کے بارے میں معلوم کرنا چاہا... لیکن اس کے منہ سے ہوٹل کے مالک کے بارے میں اور اپنی زندگی کے بارے میں کچھ جملے نکل گئے... مالک نے اسے فوراً طلب کر لیا... پیرا لگا تھر تھر کاٹنے... اس نے بتایا کہ اب مالک اسے جان سے مار ڈالے گا... بس ہم اس کی مدد کے چکر میں اس کے ساتھ اوپر آ گئے... اور زاران کا پتا چلانے کی بجائے... پیرے کی ہمدردی میں اس جیل میں

بچ گئے۔“

”اور ہوٹل کے مالک کا کہنا ہے کہ وہی وہ بلیک میل ہے۔“ فرزانہ نے جلدی سے کہا۔

”ہاں! یہ بات بھی ہے۔“

”مطلب یہ کہ مجرم ہمیں خود ہی اپنے قریب لے آیا۔۔۔“ آصف مسکرایا۔

”اپنے قریب نہیں۔۔۔ اپنی جیل کے قریب۔۔۔ وہ خود نہ جانے کہاں ہے۔“

”یہاں رکھنے سے اس کا مقصد کیا ہے۔“

”یہاں جو لوگ قید ہیں۔۔۔ وہ سب کے سب بہت دولت مند ہیں۔۔۔ یہ بلیک میل ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرتا ہے۔۔۔ جو ذرا اکڑتا ہے۔۔۔ اس کا کھانا اور پانی بند کر دیتا ہے۔“

”کھانا اور پانی دیتا کیسے ہے۔“ انسپٹر کامران مرزا بولے۔

”اوپر دیکھیں۔۔۔ کافی اونچی چھت ہے۔۔۔ اس چھت میں چوکور سوراخ ہیں۔۔۔ ان سوراخوں میں سے رسیوں کے ذریعے کھانا اور پانی لٹکایا جاتا ہے۔۔۔ جو رقم کی ادائیگی نہیں کرتا ہے۔۔۔ اس کی چھت کا سوراخ نہیں کھلتا۔“

”اور یہ رقم کس طرح وصول کرتا ہے۔“

”چیک بکس ان لوگوں کے گھروں سے اپنے آدمی بھیج بھیج کر منگوا لی ہیں۔۔۔ مطلب یہ کہ ان لوگوں نے رقعے لکھ لکھ کر اپنے گھر والوں کو بھیجے کہ آنے والوں کو چیک بکس دے دیں۔۔۔ ورنہ یہ بلیک میل ہمیں بھوکا پیاسا مار دے گا۔۔۔ اور بینک بیلنس ختم ہونے کے بعد چھوڑ دیتا ہے۔ یعنی کنال کر کے چھوڑتا ہے۔۔۔ اتنا ضرور ہے کہ چھوڑ دیتا ہے۔۔۔ جان سے نہیں مارتا۔“

”رہا ہونے والے ساری بات پولیس کو کیوں نہیں بتاتے۔“

”وہ انہیں اس حد تک خوف میں مبتلا کر دیتا ہے کہ کوئی بھی پولیس کو کچھ نہیں بتاتا۔۔۔ اس کے باوجود پولیس کو کئی مرتبہ ہوٹل ڈوبے پر چلک گزرا۔۔۔ اس کی تلاشی لی گئی۔۔۔ لیکن کچھ نہ مل سکا۔۔۔ پولیس ہوٹل کی تلاشی لیتے لیتے تنگ آ گئی ہے۔ اور اب تو گویا اس نے توبہ کر لی ہے۔۔۔ کہ ہوٹل ڈوبے کی تلاشی نہیں لے گی۔“

”پہلے۔۔۔ اب سوال یہ ہے کہ ہمارا کیا پروگرام ہے۔۔۔ کیا ہمارے پاس محمود کا چاقو نہیں ہے۔“ انسپٹر کامران مرزا نے کہا۔

”محمود کا چاقو تو ہے پر کام کرتا ہے۔۔۔ سینٹ اور کنکریٹ پر نہیں۔۔۔ ہم کوٹھری کے دروازے کاٹ سکتے ہیں۔۔۔ لیکن ان پر پہلے ہی دروازے نہیں ہیں۔۔۔ اب ہم ہیں۔۔۔ یہ کوٹھریاں ہیں اور یہ برآمدہ

”ہمارے علاوہ تیس کے قریب افراد اور ہیں... یہ تبدیل ہوتے رہتے ہیں، یعنی ان میں سے کوئی کنکال ہونے کے بعد یہاں سے چلا جاتا ہے... تو کوئی اس کی جگہ لے لیتا ہے۔“

”لیکن کیسے؟“ وہ سب ایک ساتھ بول اٹھے۔

”جیل خانے میں چھتوں کے ذریعے گیس چھوڑی جاتی ہے... اس گیس کے اثر سے سب لوگ بے ہوش ہو جاتے ہیں... بس جب آنکھ کھلتی ہے تو بندے تبدیل ہوتے ہیں۔“

”ادہ... ادہ۔“

ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا... کیونکہ یہ ایک بات ان کے لیے مفید نظر آئی تھی:

”لیکن ایسا نہ جانے کتنے دنوں بعد ہوتا ہوگا۔“

”یہاں آنے کے بعد اور ساری صورت حال معلوم ہو جانے کے بعد کون ہے... جو زیادہ دیر تک یہاں ٹھہرنا پسند کرے گا... سب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں بس، لہذا اپنی ساری دولت اس کے حوالے کر کے نکلنے کی کرتے ہیں...“

”ہوں... پھر بھی... ہمیں نہ جانے کتنے دن انتظار کرنا پڑے۔“

”مجبوری ہے... ایسا تو کرنا پڑے گا۔“

”ہے... برآمدہ اس قدر کنکریٹ کا ہے کہ بس کیا بتاؤں۔“

”چلے اگل کوئی بات نہیں، نہ بتائیں۔“ آفتاب بولا۔

”تو کیا اس نے آپ لوگوں کی چیک بکس بھی منگوائی ہیں۔“

”نہیں! ہم لوگوں سے اس نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔“

”ڈر گیا بے چارہ۔“ فاروق نے جلدی سے کہا۔

”لیکن اب جب کہ ہم بھی یہاں پھنس چکے ہیں... اور باہر موجود ہمارے ساتھی بلکہ اعلیٰ حکام تک کو پتا چل چکا ہے... تو کیا ہوٹل کی اینٹ سے اینٹ نہیں بجا دی جائے گی۔“

”اس کا کہنا ہے... اس طرح بھی پولیس ہم لوگوں تک نہیں پہنچ سکے گی... اور اگر ہوٹل کو گرایا گیا... تو ہم سب اس کے بلے کے نیچے دبے رہ جائیں گے... گویا یہ کوٹھریاں ہمارے مقبرے بن جائیں گی۔“ انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

”ارے باپ رے... اس قدر خوفناک باتیں تو نہ کریں۔“ آفتاب نے بوکھلا کر کہا۔

”خیر بتا دو... بتا دو جس قدر خوفناک باتیں تم برداشت کر سکتے ہو... اتنی کر لوں۔“ انہوں نے بے چارگی کے عالم میں کہا اور وہ مسکرانے لگے...

”اور یہاں کل کتنے آدمی ہیں... یعنی ان کوٹھریوں میں۔“

”اچھا اللہ مالک ہے۔۔۔“

ایسے میں جیل خانے میں ایک آواز ابھری:

☆☆☆☆☆

دو کروڑ کی مچھلی

”تم لوگوں کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔۔۔ لو۔۔۔ جو کر سکتے ہو کر لو۔۔۔ آج کی تاریخ میں اور ایک شکار کنڈال ہو گیا۔۔۔ اب ظاہر ہے، ہم اسے یہاں رکھ کر کیا کریں گے۔۔۔ مفت میں تو روٹیاں کھلانے سے رہے۔۔۔ جو کچھ اس سے حاصل ہو سکتا تھا، وہ ہم کر چکے۔۔۔ اب یہ ایک بیکار لاش ہے۔۔۔ لہذا اسے قارغ کیا جا رہا ہے۔۔۔“

”ہاں جناب!“

انہوں نے دیکھا۔۔۔ ایک کھوڑی سے ایک دبلا پتلا آدمی دوڑ کر باہر نکلا تھا۔۔۔ اس کے چہرے پر بے تحاشہ خوشی تھی:

”تمہاری رہائی کا وقت ہو گیا ہے۔۔۔ تھوڑی دیر بعد تم آزاد ہو گے۔۔۔ یہ سب لوگ تمہاری آزادی کا منظر دیکھیں گے۔۔۔ اور یہ حسرت محسوس کریں گے کہ کاش ہم بھی جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔۔۔ تمام لوگ اس کی آزادی کا منظر دیکھنے کے لیے کوٹھریوں

بڑائے۔

”جی نہیں! یہ اتنے لمبے چوڑے انتظامات اس نے ہمارے لیے نہیں کیے... تمام انتظامات پہلے سے چلے آرہے ہیں... اور یہ شخص کوئی نیا جرائم پیشہ نہیں ہے... بہت پرانا ہے... یہ بلیک میل بھی ہے اور کرائے کا قاتل بھی... کچھ لوگ اس سے یہ کام بھی لیتے ہیں... جیسے کوئی شخص اپنے کسی دشمن کو قتل کرانا چاہتا ہے... تو وہ اس کے ذریعے یہ کام لیتا ہے اور اسے اس کام کا معاوضہ دیتا ہے... اب یہ اور بات ہے کہ معاوضہ لینے کے بعد بھی یہ اسے بلیک میل کرتا ہے... کیونکہ اس طرح ایسا شخص اس کی مٹھی میں آ جاتا ہے... اور بالکل ایسا ہی داراب خان کے ساتھ ہوا... غالباً داراب خان نے اپنے بھائی سرخاب خان کو قتل کرانا چاہا تھا... اس نے اس سے معاملہ طے کر لیا... اور اس نے معاوضہ لے کر اس کے بھائی کو ٹھکانے لگا دیا... ٹھکانے لگانے کے بعد اب داراب خان اس کی مٹھی میں آ گیا... اس نے اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیا... یہاں تک کہ تمام نقدی اس سے وصول کر لی... نقدی کے بعد اس نے اسے مجبور کیا کہ اب وہ اپنی حویلی اور تمام زمین بھی فروخت کر کے رقم اسے دے دے... اس کے بعد وہ فارغ ہو جائے گا... کیونکہ پھر اس کے پاس اسے دینے کے لیے کچھ رہ ہی نہیں جائے گا... یہی وجہ ہے کہ جب اس نے حویلی

سے باہر آ جائیں... آج سے ہم طریقہ بدل رہے ہیں... پہلے یہ کرتے تھے کہ گیس چھوڑی جاتی تھی... اس سے جیل میں موجود لوگ بے ہوش ہو جاتے تھے... اور ان کے درمیان سے اس آدمی کو اٹھالیا جاتا تھا جسے رہا کرنا ہوتا تھا... لیکن آج تم لوگ ایک ایسا طریقہ دیکھو گے... کسی کو بے ہوش نہیں کیا جائے گا...

اور پھر آواز بند ہو گئی... برآمدے کی چھت میں ایک کافی چوڑا سوراخ نمودار ہوا... پھر اس سے ایک جھولا لٹکا نظر آیا... جھولا لٹھ بہ لٹھ نیچے آ رہا تھا... آخر وہ فرش تک آ گیا:

”چلو تم نمبر 12... اس جھولے میں بیٹھ جاؤ... اسی کے ذریعے تمہیں اوپر کھینچ لیا جائے گا... رہائی کی نعمت تمہیں اس لیے حاصل ہو رہی ہے کہ تم نے اپنی دولت ہمارے قدموں میں ڈھیر کر دی اور بس۔“

وہ شخص ہدایت کے مطابق جھولے میں بیٹھ گیا... جھولا اوپر اٹھنے لگا... ظاہر ہے... اسے کسی لیور کے ذریعے اوپر اٹھایا جا رہا تھا۔ پھر ان کے دیکھتے ہی دیکھتے جھولا چھت سے اوپر ہو گیا اور سوراخ بند ہو گیا:

”کیا اس طرح سے یہ شخص ہمیں یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ ہم لوگ اس کی اس جیل میں بالکل بے بس ہیں۔“ پروفیسر داؤد بد

اور زمین خان رحمان کے ہاتھ فروخت کر دی تو ساتھ ہی وہ کرائے کے مکان میں آ گیا۔۔۔ کیونکہ تمام رقم تو اس نے اس شخص کو ادا کرنا تھی۔۔۔ بس یہ ہے کل کہانی۔۔۔ اخبارات میں جس لاش کی تصویر شائع ہوئی۔۔۔ وہ دراصل سرخاب خان کی تھی۔۔۔ لیکن داراب خان اسے بھلا اپنے بھائی کی حیثیت سے کیوں پہچانتا۔۔۔ وہ بھی ظاہر کرتا رہا کہ یہ اس کے بھائی کی لاش نہیں ہے۔۔۔ میں نے ڈرائنگ روم میں اس کے بھائی کی تصویر دیکھی تھی۔۔۔ تم لوگوں نے بھی دیکھی تھی۔۔۔ مجھے وہ تصویر جانی پہچانی لگی تھی۔۔۔ اور آخر میں نے اخبارات میں وہ تصویر تلاش کر لی تھی۔۔۔ اس ساری بات کا مطلب یہ ہوا کہ اب ہم اسی بلیک میل کے قبضے میں ہیں اور اس نے ہمارے فرار کے تمام راستے بند کر دیے ہیں۔۔۔ زیر زمین یہ تمام جیل اور برآمدے وغیرہ سخت ترین کنکریٹ کے بنوائے گئے ہیں۔۔۔ میں نے ان دیواروں پر محمود کا چاقو آزمایا تو وہ فل ہو گیا۔۔۔ ان حالات میں آخر ہم کیا کر سکتے ہیں۔۔۔ لیکن پھر بھی ہم ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھیں گے۔۔۔ اپنا کام تو ہمیں کرنا ہوگا۔۔۔ ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ آپ لوگ بھی یہاں آ گئے۔۔۔ اب ہماری طاقت دوگنا ہو گئی ہے۔۔۔“ انسپکٹر جمشید یہاں تک کہہ کر رک گئے۔۔۔ اس وقت ایک آواز ابھری:

”انسپکٹر جمشید میری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔۔۔ نہ میں تم سے

مقابلہ کرنا چاہتا ہوں۔۔۔ لیکن اب مشکل یہ آئی کہ تم میرے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئے ہو۔۔۔ اب اگر میں تمہیں رہا کرتا ہوں تو تم مجھے چھوڑ دو گے نہیں۔۔۔ لہذا مجبوری ہے۔۔۔ جب تک زندہ رہنا چاہو۔۔۔ اس جیل میں رہ لو۔۔۔ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔۔۔ اپنی موت مر جاؤ تو اور بات ہے۔۔۔ یا پھر اگر اس زندگی سے تنگ آ جاؤ تو بتا دیتا۔۔۔ تمہیں موت کی خند سلا دوں گا۔“

”خودکشی حرام ہے۔۔۔ دیے تم صرف یہ بتا دو۔۔۔ میں نے جو تفصیل سنائی ہے۔۔۔ وہ درست یا نہیں۔“ انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔
”وہ بالکل درست ہے۔“

”تو پھر صرف اتنا اور بتا دو۔۔۔ تم نے داراب خان شمشیر کو کس بنیاد پر بلیک میل کیا تھا۔“

”اس نے میرا ہر مطالبہ مانا ہے۔۔۔ یہاں تک کہ اب بالکل کنگال ہو گیا ہے۔۔۔ لہذا میں وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔۔۔“

”خیر کوئی بات نہیں۔۔۔ تم میں ایک تو اچھی بات ہے۔۔۔ دیے ہم تم سے ایک بات کہنا چاہتے ہیں۔۔۔“ انسپکٹر جمشید نے کسی خیال کے تحت کہا۔

”اور وہ کیا؟“

”تم لوگوں سے اس کی ساری جمع پونجی لے کر انہیں رہا کر

دیتے ہو.... یہ سودا تم ہم سے کیوں نہیں کر لیتے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکا۔

”مطلب یہ کہ ہم بھی تمہیں اپنی جمع پونجی دے دیتے ہیں.... بس تم ہمیں رہا کر دو۔“

”لیکن اس صورت میں تو میں خود مارا جاؤں گا.... عام لوگ تو کنگال ہونے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ جاتے ہیں.... انہیں میرے بارے میں کچھ معلوم جو نہیں ہوتا.... نہ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں ہوٹل ڈوہے کا مالک ہوں.... لیکن تم لوگوں کو یہ معلوم ہو چکا ہے.... اس لیے تم مجھے کب چھوڑو گے۔“

”تمہیں معلوم نہیں۔“ انپکڑ جمشید نے سرسراہتی آواز منہ سے نکالی۔

”مجھے معلوم نہیں.... کیا معلوم نہیں۔“

”یہ کہ.... میرے پاس، پروفیسر صاحب کے پاس اور خان رحمان کے پاس کتنی دولت ہے، اس دولت سے ایسے کئی ہوٹل خریدے جاسکتے ہیں.... لہذا تم ہمیں کنگال کر کے غائب ہو جاؤ.... یعنی ہمارے جیل سے نکلنے کا انتظام کر دو.... اور غائب ہو جاؤ.... اس صورت میں کیا ہم تمہیں تلاش کر سکیں گے.... جب کہ ہمیں معلوم نہیں کہ تم کون ہو۔“

”اوہ!“ اس کے منہ سے نکلا۔

پھر ایک دو منٹ تک خاموشی رہی.... شاید وہ سوچ میں پڑ گیا تھا.... اور اس کا مطلب یہ تھا کہ انپکڑ جمشید اسے اپنی باتوں میں لے آئے تھے، آخر انہوں نے پھر کہا:

”لگتا ہے.... تم زیادہ ہی گہری سوچ میں ڈوب گئے ہو۔“

”ہاں! ایسی ہی بات ہے.... میں نے تم لوگوں کی تاریخ پڑھی ہے۔“

”کون سی تاریخ.... تاریخ پیدائش؟“ فاروق بول پڑا۔

”نہیں.... تم لوگوں کی زندگیوں کی تاریخ.... لہذا میں یہ

خطرہ مول نہیں لوں گا.... یہ پیش کش واقعی بہت زبردست ہے....

لیکن اس کے بعد تم کہاں چین سے بیٹھو گے.... اور میں ایک بات

اچھی طرح جانتا ہوں....“ یہ کہتے ہوئے وہ ہنسا۔

اس کی ہنسی کی آواز سن کر انپکڑ جمشید کے چہرے پر

حیرت دوڑ گئی.... پیشانی پر ہل پڑ گئے.... انہوں نے کہا:

”اور وہ کیا بات ہے.... جو تم اچھی طرح جانتے ہو۔“

”یہ کہ مجرم سے کہیں نہ کہیں.... کوئی نہ کوئی غلطی ہو جاتی

ہے.... اور وہ غلطی اسے قانون کی گرفت میں لے آتی ہے.... لہذا میں

تمہیں کوئی ایسا موقع نہیں دوں گا کہ تم میری غلطی سے فائدہ اٹھاؤ اور

مجھ تک پہنچ جاؤ... اس طرح وہ تمام دولت بھی تم حاصل کر لو گے... اور میں بھی پھنس جاؤں گا... نہیں میں خطرے کا یہ سودا نہیں کروں گا۔

”دھت تیرے کی...“ محمود نے جھلا کر اپنی ران پر ہاتھ مارا۔

”کک... کیا ہوا بھائی۔“ آصف بوکھلا اٹھا۔

”مچھلی کا نئے سے نکل گئی۔“

”مم... مچھلی... کک... کون سی مچھلی...“ پردیسر داؤد نے گھبرا کر کہا۔

”آپ کو کیا ہوا...“

”وہ... وہ... مجھے مچھلی کی بھوک لگ گئی۔“

”ارے باپ رے۔“ وہ بوکھلا اٹھے۔

”آپ نے سنا... جناب باس صاحب... اب ہم انہیں مچھلی کہاں سے کھلائیں۔“

”ہوٹل میں موجود ہے... بھجوا دیتا ہوں... لیکن...“

”اب تم یہ لیکن کہاں سے لے آئے۔“

”اپنے گھر سے...“ اس نے فوراً کہا۔

”خیر... آگے کہو۔“

سنا

”لیکن... اس مچھلی کی قیمت دینا ہوگی۔“
”چلو منظور ہے... میری چیک بک منگوا لو۔“ انسپکٹر جمشید بولے۔

جواب میں وہ ہنسا... انسپکٹر جمشید کو پھر جھٹکا لگا... ادھر اس نے کہا:

”میں اتنا پاگل نہیں...“

”کیا مطلب...“

”میں تم لوگوں کو چالاکی دکھانے کا کوئی موقع نہیں دوں گا... تم لوگوں کے پاس یہاں جو کچھ ہے... بس وہ دے دو... اور میں دیکھ رہا ہوں... تمہارے ساتھی کی کلائی پر جو گھڑی ہے... وہ دو تین کروڑ سے کم کی تو ہے نہیں۔“

”اوہ!“ خان رحمان چونک اٹھے، پھر بولے:

”بہت تیز نظر ہے تمہاری... خیر... میں اپنے دوست کی خواہش پوری کرنے کے لیے یہ گھڑی قربان کر سکتا ہوں... بھیج دو مچھلی... لے لو یہ گھڑی۔“

”پہلے گھڑی... پھر مچھلی۔“

”اچھی بات ہے۔“

اور پھر چھت میں سوراخ ہوا... اس میں سے ایک برتن

”باس! پورے ہوٹل کو پولیس کی بھاری تعداد نے گھیر لیا ہے۔“

”اوہ!“ باس کے منہ سے نکلا۔ ساتھ ہی جیل تار کی میں ڈوب گئی۔

☆☆☆☆☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

رسی کے ذریعے نیچے اتر آئے۔ انہوں نے اپنی گھڑی اس میں رکھ دی... رسی اوپر کھینچ لی گئی... جلد ہی ایک ٹرے تلی ہوئی مچھلیوں سے لبریز اتار دی گئی۔ انہوں نے مچھلی اٹھالی... اور ٹرے میں رکھ لی... اس وقت پروفیسر داؤد کے منہ سے نکلا:

”دو کروڑ کی مچھلی... کمال ہے۔“

”کوئی بات نہیں... دو کروڑ آپ کی خواہش کے آگے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔“ خان رحمان بولے۔

”چلو... پھر آؤ... شروع کرتے ہیں۔“ پروفیسر بولے۔

انہوں نے مچھلی کی طرف ہاتھ بڑھائے ہی تھے کہ ٹھٹھک کر رک گئے... جیل کے کچھ ساتھی حسرت زدہ انداز میں مچھلی کی طرف دیکھ رہے تھے:

”آؤ بھی آؤ... تم بھی آؤ۔“ پروفیسر مسکرائے۔

”لیکن یہ دو کروڑ کی مچھلی ہے۔“

”تو کیا ہوا... آؤ۔“

وہ بھی جھجکتے ہوئے ان کے ساتھ شریک ہو گئے... انسپکٹر جمشید نے باقی سب کو بھی دعوت دے ڈالی اور پھر تو پیچھے کوئی بھی نہ رہ گیا... سبھی مچھلی کی دعوت میں شریک ہو گئے۔ آخر وہ فارغ ہو گئے... اسی وقت انہوں نے کسی کو کہتے سنا:

اپنے کمروں کو چلے جائیں.... کیونکہ پولیس اس ہوٹل کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا ارادہ رکھتی ہے.... جو گا ہک اندر ٹھہرے گا.... اسے بھی گرفتار کر لیا جائے گا۔“

یہ اعلان تین بار دہرایا گیا.... پھر گا ہک حضرات جلدی جلدی نکلنے لگے۔ آخر ہوٹل گا ہکوں سے خالی ہو گیا.... اب جو مسافر کمروں میں ٹھہرے ہوئے تھے.... ان سے کہا گیا:

”ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے لوگ اپنے اپنے کمروں میں رہیں.... انہیں بہت جلد قارغ کر دیا جائے گا۔“

اور پھر مسافروں کو معمولی تلاشی اور ان کے شناختی کارڈ دیکھ کر قارغ کر دیا.... اب ہوٹل میں صرف عملے کے لوگ رہ گئے.... انہوں نے سارے عملے کو ہوٹل کے باہر جمع کر لیا.... پھر آئی جی صاحب نے ان سے کہا:

”اس ہوٹل کا مالک کون ہے۔“

”ان کا نام قائم جان جاسانی ہے۔“

”وہ اس وقت کہاں ہیں.... جھوٹ نہ بولنا.... جھوٹا بیان

دینے والے کو جیل میں ڈالا جائے گا۔“

”ہوٹل کے کسی ملازم کو ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم

ہوتا.... اگر ہو سکتا ہے تو وہ ہیں نواب شاہ فیجریا نائب فیجریا زوار جان

تیئوری

”سر! انسپکٹر کامران مرزا پارٹی کی طرف سے کوئی جواب نہ مل رہا.... اس کا مطلب ہے.... وہ بھی پھنس گئے ہیں۔“ ایک پولیس آفیسر نے آئی جی صاحب کو فون پر اطلاع دی:

”ٹھیک ہے.... میں آرہا ہوں.... ہوٹل کو چاروں طرف سے گھیر لو.... ہوٹل کا کوئی ملازم فرار نہ ہونے پائے.... جو نکلنے کی کوشش کرے.... اسے گرفتار کر لو۔“

”اوکے سر!“

جلد ہی ہوٹل کو مکمل طور پر گھیرے میں لے لیا گیا.... پھر

اعلان کیا گیا:

”پورے ہوٹل کو گھیر لیا گیا ہے.... ہوٹل کا جو ملازم کسی بھی طرف سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا.... اسے گرفتار کر لیا جائے گا.... پورے ہوٹل کی تلاشی لی جائے گی.... مقامی گا ہک حضرات سے درخواست ہے.... باہر نکل آئیں اور اپنے شناختی کارڈ دکھا دکھا کر

”تالا کھلوائیں۔“

”سرا میرے پاس اس کی چابی نہیں ہے... چابی صرف مالک کے پاس ہوتی ہے۔“

”تب پھر نائب فیجر زدار جان اور ہمارے وہ ساتھی کہاں ہیں، جنہیں وہ اوپر لے کر آئے تھے۔“

”مجھے کچھ معلوم نہیں سر۔“

”معلوم ہو جائے گا... فکر نہ کرو۔“ انہوں نے سرد آواز میں کہا۔

”جی... کیا مطلب... کیا معلوم ہو جائے گا۔“

”جو آپ کو معلوم نہیں...“ یہ کہہ کر وہ ماتحتوں کی طرف

مڑے۔

”اسے گرفتار کر لیں... اور اس دروازے کو کھلوائیں۔“

”او کے سر۔“

تیوری کے ہاتھوں میں فوراً جھکڑی لگا دی گئی... پھر تالا توڑا گیا... دروازہ کھولا گیا۔ اب آئی جی صاحب نے تیوری سے کہا:

”کمرے کے اندر چلو۔“

”جج... میں... میں۔“

... آج نواب شاہ چھٹی پر ہیں... زدار جان ڈیوٹی پر موجود تھے... تھوڑی دیر پہلے کچھ لوگ ملنے کے لیے آئے تھے، وہ انہیں اوپر مالک کے کمرے کی طرف لے گئے تھے... کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ وہ مالک سے ملنا چاہتے ہیں، زدار جان صاحب نے انہیں بتایا کہ وہ نہیں ہیں تو انہوں نے کہا کہ انہیں کم از کم ہوٹل کے فیجر کے کمرے تک تو لے جایا جائے... پھر وہ اوپر چلے گئے تھے... اس کے بعد سے اب تک ان کی واپسی نہیں ہوئی۔“

”آپ کون ہیں اور آپ کا نام کیا ہے۔“

”میں ہوٹل کا ہیڈ بیرا ہوں۔“

”خوب! آپ ہمیں ہوٹل کے مالک کے کمرے تک لے

چلیں۔“

”آئیے۔“ اس نے کہا۔

”تم لوگ یہیں ٹھہرو... اور ان لوگوں کا دھیان رکھنا... ان

میں کوئی ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔“ انہوں نے ماتحتوں سے کہا۔

”او کے سر۔“

اب وہ تیوری کے ساتھ اوپر آئے... کمرے کا

دروازہ بند تھا اور اس پر تالا لگا ہوا تھا:

”یہی کمرہ ہے جناب۔“

”کیوں کیا بات ہے... تم تو اس کمرے اور مالک کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے... نہ نائب منجر اور ان لوگوں کے بارے میں کچھ جانتے ہو... جو اس کے ساتھ اوپر آئے تھے... پھر ڈر کیوں رہے ہو۔“

”نن... نہیں۔“ وہ چلایا۔

”اسے اٹھا کر فرش پر پھینک دو۔“

”نن نہیں۔“ وہ چیخا۔

”جلدی اٹھاؤ اسے۔“ وہ سرد لہجے میں بولے۔

چار کاٹھیل اس کی طرف بڑھے:

”ایک منٹ ٹھہریں جناب... میں بتاتا ہوں۔“

”تم تو کہہ رہے تھے... تم کچھ نہیں جانتے۔“

”جتنا جانتا ہوں... اتنا بتا دیتا ہوں۔“

”چلو بتاؤ پھر...“

”جو نہی آپ مجھے اس کمرے کے فرش پر پھینکیں گے...“

اس فرش میں ایک خلا نمودار ہوگا اور میں نائب ہو جاؤں گا۔“

”کیا مطلب... تم کہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”اس ہوٹل کے نیچے... نیچے فوم کے کئی گدے اوپر تلے

رکھے گئے ہیں... لہذا اگر نے والوں کو چوٹ نہیں لگتی، وہ زندہ سلامت

رہتے ہیں۔“

”لیکن نیچے ہے کیا۔“

”باس کی جیل۔“

”باس کی جیل... کیا مطلب؟“ آئی جی چوٹے۔

”جی ہاں! باس نے نیچے ایک جیل بنا رکھی ہے۔“

”اور نیچے اس جیل کا راستہ کہاں ہے۔“

”یہ بات صرف باس کو معلوم ہے۔“

”کیا واقعی... اگر تمہیں معلوم ہے تو بتا دو... ورنہ اگر ہمیں

معلوم ہوا کہ تم یہ بات جانتے تھے... تو تمہیں کوئی رعایت نہیں دی

جائے گی۔“

”اگر میں اپنی باتیں بتا سکتا ہوں تو یہ بات کیوں نہیں بتا

سکتا۔“

”ہوں! اچھا خیر... اب سوال یہ ہے کہ ہم اس جیل تک

کیسے پہنچیں۔“

”ظاہر ہے... اسی خلا کے ذریعے نیچے اترنا پڑے گا۔“

”لیکن کیسے... سب لوگ ڈریں گے...“

”اوہ ہاں یاد آیا... ایک اور کمرہ ہے، اس میں صرف چوکر

سوراخ کھلا ہے... اس کے ذریعے کھانا پکایا جاتا ہے۔“

آواز آئی۔

”لیجیے... اب تو آپ بھی اس کی حوصلہ افزائی کرنے

گئے۔“

”ان حالات میں ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں... اب سوال یہ ہے کہ آپ لوگوں کو یہاں سے کیسے اوپر لایا جائے... نیچے والا راستہ کیسے کھلتا ہے... یہ یہاں کسی کو معلوم نہیں اور باس صاحب غائب ہیں۔“

”کوئی بات نہیں... اس سوراخ کو بڑا کروالیں اور سیڑھی لٹکا دیں... اتنی بڑی سیڑھی نہ ہو تو دوسرے حیاں بندھوا لیں۔“

”اچھی بات ہے... اب یہی کرنا ہوگا۔“

اور پھر وہ سب اس طرح اوپر آ گئے... انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا... جیل میں جو اور قیدی تھے... ان سب کے نام پتے اور دوسری تفصیلات نوٹ کرنے کا کام اکرام کے سپرد کیا گیا... اور انہوں نے گھر کی راہ لی... کیونکہ فی الحال تو وہ آرام کرنا چاہتے تھے... وہ گھر پہنچے تو انہوں نے بلند آوازیں سنیں:

”اللہ تیرا شکر ہے... اللہ تیرا شکر ہے۔“

اب پتا چلا... تمام بیگمات اور بچے وہاں جمع ہو چکے تھے اور سب مل کر ان کے لیے زور شور سے دعائیں کرتے رہے

”بہت خوب! یہ ہوئی نا بات... چلو جلدی کرو... اس کمرے کو کھولو۔“

وہ دوسرے کمرے میں آئے... تیموری نے ایک بٹن دبا دیا، فوراً اس کمرے کے فرش میں ایک بڑی ٹرے جتنا خلا نمودار ہو گیا... انہوں نے نیچے جھانکا تو گھپ اندھیرا تھا... کچھ بھی نظر نہ آیا... اب انہوں نے ٹارچ کی روشنی نیچے ڈالی... تو ایک آواز ابھری:

”کون ہے بھائی... کیوں پریشان کر رہے ہیں... بڑی مشکل سے تو اندھیرا ہوا تھا... اب اسے بھی باقی رہنے نہیں دے رہے۔“

”یہ... یہ تم ہو فاروق...“ آئی جی صاحب چپک کر بولے۔

”پپ پتا نہیں... اندھیرے میں کیا کہہ سکتا ہوں کہ میں کون ہوں، یہاں تو بہت سے لوگ ہیں۔“

”حد ہو گئی... ان حالات میں بھی مذاق کی سوجھ رہی ہے۔“ محمود کی آواز ابھری:

”خوش گوار حالات میں تو سبھی مذاق کر لیتے ہیں... ایسے حالات میں مذاق کرنا ہی تو خوبی ہے۔“ اوپر سے آئی جی صاحب کی

”تب پھر اسے کہتے ہیں، ناچ نہ جانے آگن ٹیڑھا۔“
فاروق نے منہ بتایا۔

”بھائی کیوں محاورات کی ٹانگیں توڑنے پر تل گئے ہو۔“
انسپکٹر جمشید نے بڑا سامنہ بتایا۔

”ان حالات میں ہم اور کر بھی کیا سکتے ہیں اکل۔“ آصف
بولا۔

”گگ... کن حالات میں... کیا ہوا حالات کو... کسی
کی نظر تو نہیں لگ گئی۔“ پروفیسر داؤد بے خیالی کے عالم میں بولے۔
”آپ نے ہی کون سی کسر چھوڑ دی... آپ بھی تو تھمیٹ
لائے ایک عدد محاورہ...“ فرحت مسکرائی۔

”گگ... اب یہاں محاورات کا بازار لگ کر رہے
گا... اور پھر وہ بھانت بھانت کی بولیاں سنائی دیں گی... کہ کان
پڑی آواز سنائی نہیں دے گی...“

”حد ہو گئی... بلکہ توبہ ہے تم سے... رہی سہی کسر سب کی
طرف سے پوری کر دی... اب یہاں کوئی خاک محاورہ بولے گا اور
نہیں تو کیا...“

”میرا خیال ہے کامران مرزا... انہیں ان کے حال پر
چھوڑتے ہیں اور ہم لاہری میں چل کر کیس پر بات کر لیتے

تھے... کیونکہ یہ بات عام ہو چکی تھی کہ وہ لوگ گم ہو گئے ہیں:

”آئی جی صاحب نے آپ لوگوں کے مل جانے کی خبر سنا
دی تھی... ہم سب نے اسی وقت شکرانے کے نوافل پڑھے تھے اور
اچھے اچھے حرے دار کھانے تیار کرنے میں مشغول ہو گئے تھے...“
بیگم جمشید نے خوشی سے بھرپور آواز میں انہیں بتایا۔

”بھئی واہ... بیگم ہوں تو آپ جیسی۔“
”اللہ کا شکر ہے... آپ نے یہ تو کہا بھائی جان۔“ بیگم
خان رحمان بول پڑیں۔

اس پر سب کو ہنسی آگئی... پھر کھانا سجا دیا گیا...
کھانوں کی خوشبوؤں نے ان کی بھوک اور چمکا دی... اور وہ کھانے
پر ٹوٹ پڑے:

”بھئی واہ... کھانا ہو تو ایسا۔“
”اللہ کا شکر ہے... آپ کو پسند تو آیا۔“
”اسے کہتے ہیں، نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ آفتاب کی آواز
سنائی دی۔

”کے کہتے ہیں نیکی اور پوچھ پوچھ۔“ محمود نے چونک کر
پوچھا۔

”پپ پتا نہیں۔“

ہیں... کیونکہ اس کا مجرم ابھی تک دندناتا پھر رہا ہے... اور ہم پر ہنس رہا ہوگا... اپنے قریبی ساتھیوں کے درمیان کہہ رہا ہوگا... بنے پھرتے تھے بڑے سراغریساں... ساری قلعی کھول کر رکھ دی ہے... تین میں رہے نہ تیرہ میں، اب کسی کو شکل دکھانے کے قابل نہیں رہ جائیں گے۔“

”ہائیں ہائیں... ابا جان! آپ ہمیں تو کہہ رہے تھے... اور خود آپ پے در پے بلکہ ترکی یہ ترکی محاورات بولے چلے جا رہے ہیں...“ قاروق کے لہجے میں بلا کی حیرت در آئی۔

”واقعی... اکل آپ نے تو ہماری ترکی تمام کر دی۔“

”حد ہوگئی... دھت تیرے کی... جسے دیکھو... محاورے پر محاورہ بولے چلا جا رہا ہے، گویا سب پر محاورات کا بھوت سوار ہو گیا ہے۔“ خان رحمان نے تملاکر کہا۔

”جج... جی اکل... کک... کیا کہا آپ نے... محاورات کا بھوت...“ قاروق نے جلدی سے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

”کیوں... کیا ہوا؟“

”مم... میرا مطلب ہے... یہ تو کسی ناول کا نام ہو سکتا ہے۔“

”بس کامران مرزا... معلوم ہو گیا۔“

”کیا معلوم ہو گیا جمشید... کچھ ہمیں بھی تو پتا چلے۔“
پروفیسر داؤد نے جلدی سے پوچھا۔

”یہ کہ... اب ان لوگوں سے کام کی بات کی امید رکھنا بہرے کے آگے بین بجانے کے برابر ہے... کیونکہ گدھا کیا جانے زعفران کا بھاؤ...“ انسپکٹر جمشید نے جلدی سے انداز میں کہا۔

”بس جمشید بس... تم نے بھی آخر خر بوزوں کو دیکھ کر رنگ پکڑ لیا، مطلب یہ کہ تم بھی ان کے رنگ میں رنگ گئے...“ پروفیسر داؤد نے انہیں حیرت نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”لیکن آپ مجھے ان نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں۔“
انسپکٹر جمشید نے گھبرا کر کہا۔

”شکر کرو... کھا جانے والی نظروں سے نہیں دیکھ رہا...“
پروفیسر بولے۔

”یا اللہ تیرا شکر ہے۔“ انسپکٹر جمشید جلدی سے بولے۔

”معلوم ہو گیا۔“ انسپکٹر کامران مرزا جل گئے۔

”اور آپ کو کیا معلوم ہو گیا... ذرا ہمیں بھی بتا دیں۔“

”یہ کہ اس کیس پر اب صرف مجھے کام کرنا ہوگا جا کر... آپ سب یہاں بیٹھے محاورہ بازی کرتے رہیں... ان محاورات نے

ایک بات بتا دینا پسند کروں گا۔“ انسپکٹر جمشید نے بات شروع کی۔
 ”اس سے اچھی بات اور کیا ہو سکتی ہے بھلا... بتائیے۔“
 فرحت بے چینی کے عالم میں بولی۔
 ”ہم نے جیل میں... میرا مطلب ہے مجرم کی جیل میں باس
 کی آواز سنی ہے...“

”ایک منٹ اٹکل... یہ ضروری نہیں کہ وہ باس ہی ہو...
 ہو سکتا ہے... باس نے کسی اور کو بات کرنے کا اشارہ کیا ہو اور خود وہ
 خاموش رہا ہو۔“ آفتاب نے جلدی سے کہا۔

”چلو یونہی سہی... میں اپنا جملہ تبدیل کیے دیتا ہوں... جیل
 میں ہم جس شخص کی آواز سنتے رہے ہیں... اس کی آواز اور ہنسی مجھے
 جانی پہچانی معلوم ہوتی رہی ہے... لہذا اب مجرم کو پکڑنا زیادہ مشکل
 کام نہیں رہا۔“

”اور یہ ضروری نہیں کہ وہ اصل مجرم ہو۔“ آفتاب نے پھر
 کہا۔

”ہاں! اٹکل... لیکن جب ہم اس تک پہنچ جائیں گے تو اس
 کے ذریعے اصل مجرم تک بھی پہنچ سکتے ہیں۔“
 ”ہوں... یہ بات بھی ہے...“
 ”تو کیوں نہ ہم پہلے اس شخص سے بات کر لیں... جس کی

کب کسی کو کسی کام کا چھوڑا ہے کہ آپ کو کسی کام کا رہنے دیں
 گے... اپنی رو میں یہ آپ سب کو بہا لیے جا رہے ہیں اور آپ بے
 بھاؤ... بے جا رہے ہیں...“
 ”بے بھاؤ نہیں اٹکل... غلط کہہ گئے... بے مہار۔“ فاروق
 نے فوراً القہہ دیا۔

”ادوہاں فاروق تمہارا شکر یہ۔“
 ”تب پھر کم از کم مجھے ساتھ لے چلیں...“ فاروق نے
 خوش ہو کر کہا۔

”گگ... کہاں؟“ انسپکٹر کامران مرزا گھبرا کر بولے۔
 ”کیس حل کرنے کے سلسلے میں جہاں بھی آپ جانا
 چاہیں...“ وہ بولا۔

”ادوہا اچھا شکر یہ... آؤ فاروق چلتے ہیں۔“ وہ بولے۔
 ”آؤں کیسے... آپ تو اٹھے ہی نہیں۔“
 ”یہ لو! میں اٹھ گیا۔“

”تب پھر ہم سب بھی اٹھ لیے... محاورات کی گرم بازاری
 پھر کسی دن سہی۔“ آصف اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

اور وہ سب مسکرا دیے... پھر لا بھری میں آگئے:
 ”اس سے پہلے کہ ہم کیس پر بات چیت شروع کریں، میں

محرم کا نام

دروازے پر پہنچ کر انہوں نے محمود کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر دستک دی... جلد ہی دروازہ کھلا اور داراب خان شمشیر کی شکل دکھائی دی... انہیں دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت کی بجلی چمکی اور منہ سے نکلا:

”آپ لوگ... خیریت ہے۔“

یہ آواز سن کر ان کی حیرت اور بڑھ گئی:

”جی ہاں! ہم... کیا آپ ہمارے لیے اپنے گھر کا دروازہ نہیں کھولیں گے۔“

”ضرور... کیوں نہیں۔“ اس نے پریشانی کے عالم میں

کہا۔

اور پھر وہ اندر چلا گیا... جلد ہی ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہو گئے۔ اس وقت داراب خان نے کہا:

”کمرہ بہت چھوٹا ہے... آپ کو بہت نزدیک نزدیک بیٹھنا

آواز میں محسوس کرتا رہا ہوں... کیونکہ اب جو نہیں میں اس کی آواز سنوں گا تو جان جاؤں گا... وہ آواز اسی کی تھی یا نہیں۔“

”بات ٹھیک ہے... اگر آپ کو اس کے بارے میں اندازہ ہے تو پھر چلیے... اس سے ملاقات کر لیں۔“ محمود نے پر جوش انداز میں کہا۔

”بالکل! یہی میں کہتا ہوں...“

”تو پھر چلیے۔“

اور پھر وہ سب اچھل کر کھڑے ہو گئے:

☆☆☆☆☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

پڑے گا۔“

ہی ہے۔“

انسپکٹر جمشید کے تمام ساتھیوں نے یہ لطیفہ پہلے ہی سن رکھا تھا۔۔۔ اور انہوں نے جان بوجھ کر ایسا لطیفہ سنایا تھا کہ ان کے ساتھی نہ ہنسیں۔۔۔ اور ایسا ہی ہوا۔۔۔ لیکن چونکہ داراب خان نے نہیں سنا تھا، اس لیے وہ بے ساختہ ہنس پڑا اور اس کے ساتھ ہی انسپکٹر جمشید کے چہرے پر حیرت کے بادل چھا گئے۔۔۔ ان کی نظریں داراب خان پر جم گئیں۔۔۔ وہ سرد لہجے میں بولے:

”آپ ذرا اپنی کہانی پھر سے دہرائیے۔“

”جی۔۔۔ کہانی۔۔۔ کون سی کہانی؟“ اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

”میں جب آپ کی حویلی کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تھا تو مجھے دیوار پر ایک فریم کی ہوئی تصویر نظر آئی تھی۔۔۔ مجھے وہ تصویر جانی پہچانی نظر آئی تھی۔۔۔ میں نے آپ سے جب اس تصویر کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ نے بتایا تھا، یہ میرے بڑے بھائی کی تصویر ہے جو ایک مدت سے غائب ہے، پھر میرے سوال پوچھنے پر آپ نے بتایا تھا کہ آپ کا وہ بھائی دس سال پہلے غائب ہو گیا تھا۔۔۔ آج تک اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ آپ نے بتایا تھا کہ آپ نے اپنے بڑے بھائی کی رپورٹ درج کروائی تھی۔۔۔ آپ کے بھائی

”آپ ہماری فکر نہ کریں۔۔۔ ہم اس سے بھی کم جگہ میں رہ سکتے ہیں۔۔۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کرسیاں کمرے سے کھل کر فرش پر بھی بیٹھ سکتے ہیں۔“

”بہت خوب۔۔۔ تشریف رکھیں۔“

”مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔۔۔ پہلے تو ذرا وہ سن لیں۔“ ایسے میں انسپکٹر جمشید نے کہا۔

”جی۔۔۔ لطیفہ۔۔۔ یہ کیا بات ہوئی۔“ کئی آوازیں ابھریں۔

”لطیفہ سنانے کے لیے کسی بات کا ہونا، نہ ہونا ضروری نہیں۔۔۔ بس ایک لطیفہ یاد آ گیا۔۔۔ سوسنا رہا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔

”خیر سنائیں۔“ قاروق نے حیران ہو کر کہا۔

انسپکٹر جمشید لطیفہ سنانے لگے:

”میاں بیوی خریداری کے لیے بازار آگئے۔۔۔“ ایک بھکاری نے سامنے آ کر کہا۔

”اے شہزادے! میں اعدھا ہوں۔۔۔ پانچ روپے کا سوال ہے۔“

بیوی نے یہ سن کر کہا:

”دے دو اسے پانچ روپے، تمہیں شہزادہ کہہ رہا ہے، اعدھا

اور وہ وہاں سے باہر نکل آئے... ایسے میں انہوں نے اپنے ایک ماتحت کو موبائل کے ذریعے چند ہدایات دیں... پھر سیدھے دفتر پہنچے۔ اکرام انہی کا انتظار کر رہا تھا:

”السلام علیکم... ہم آگئے۔“

”وعلیکم السلام...“

پھر وہ سب بیٹھ گئے۔ اب اکرام نے کہا:

”ہوٹل کے تمام ملازمین... جرائم پیشہ ہیں... لیکن شکل صورت دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا... یہ بات تو ان کی انگلیوں کے نشانات ملانے سے معلوم ہوئی ہے... یہ سب ماہر جرائم پیشہ رہے ہیں... ان کے موجودہ لباس نے ان سب کی شکلیں بہت مہارت سے تبدیل کی ہیں... ان کا کہنا ہے کہ وہ اس کام میں بہت ماہر ہے اور شکل تبدیل کرنے کے لیے اسے کوئی خاص کام نہیں کرنا پڑتا، بس کسی کیمیکل سے کوئی کاری گری دکھا دیتا ہے اور شکل بالکل تبدیل ہو جاتی ہے... مطلب یہ کہ اسے پورے چہرے کا میک اپ نہیں کرنا پڑتا جس طرح ہم کرتے ہیں۔“

”اوہ... تب تو اس نے اپنی اصلی شکل بھی چھپا رکھی ہوگی۔“ آصف نے حیران ہو کر کہا۔

”ظاہر ہے۔“

آپ کے ساتھ نہیں، شہر میں رہتے تھے... شہر میں ان کا کاروبار تھا...“

”ہاں! میں نے یہی بتایا تھا۔“

”اور یہ کہ ان کی گمشدگی کے بعد بھی ان کے بیوی بچے وہیں رہتے ہیں۔“

”ہاں بالکل۔“

”بس تو پھر... ہمیں ان کا پتا بتادیں۔“

”13 سالار روڈ۔“ اس نے بتایا۔

ایسے میں انسپکٹر جمشید کے موبائل کی گھنٹی بجی... انہوں نے دیکھا، فون اکرام کا تھا۔ انہوں نے موبائل آن کر دیا۔ دوسری طرف سے فوراً ہی اکرام کی آواز سنائی دی:

”سر! بہت عجیب بات معلوم ہوئی ہے... بہتر ہوگا آپ یہی آجائیں۔“

”اچھا اکرام... ہم آرہے ہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے موبائل بند کر دیا اور اس سے بولے۔

”ہمیں ذرا شہر جانا پڑ گیا... ہم آپ سے پھر ملاقات کریں گے۔“

”اچھی بات ہے۔“

”تب پھر اس بات کا بھی امکان ہے کہ وہ ان ملازمین میں شامل ہو۔“

”ہاں! یہ بھی ہو سکتا ہے... خیر! ہم ان سب کو چیک کریں گے۔“ ہم باس کی آواز سن چکے ہیں... اگر وہ ان میں شامل ہے تو خفیج نہیں سکے گا۔“

”داراب خان شمشیر سے ملاقات کے دوران اس کے بھائی والی بات رہ گئی... آپ پہلے ہمیں وہ بتادیں۔“

”اس کا کہنا ہے، دس سال پہلے اس کا بڑا بھائی گم ہو گیا تھا... اس نے اس کی گمشدگی کی رپورٹ تھانہ کاشی میں درج کرائی تھی... ہم نے یہ بات چیک کی تھی... رپورٹ درج کرائی گئی تھی۔ انہی دنوں پولیس کو ایک لاش ملی تھی... اس کی شکل صورت اس کے بھائی سے ملتی جلتی تھی... لیکن اس نے بتایا تھا کہ یہ اس کے بھائی کی لاش نہیں ہے... میں نے اخبارات میں اس لاش کو دیکھا تھا... اس کا چہرہ میرے ذہن میں موجود تھا، اس لیے جب میں نے حویلی کی ڈرائنگ روم میں اس کے بھائی کی تصویر دیکھی تو مجھے محسوس ہوا تھا کہ میں نے اسے کہیں دیکھا ہے... جب ہم نے اکرام کو داراب خان کے بھائی سرخاب خان کی تصویر دکھائی تو وہ چونک اٹھا۔ اس نے کہا، یہ سرخاب ہے... اسے کسی نے قتل کر دیا تھا... اب اس تفصیل کا مطلب

یہ ہوا کہ دس سال پہلے ایک شخص کو قتل کیا گیا تھا... اس کا تعلق جرائم کی دنیا سے تھا... اور اس کا نام جرائم کی دنیا میں سرخاب تھا... گو سرخاب کا مجرمانہ نام سرخاب تھا... اور وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے... اسے قتل کرنے والے کی کلائی کی زنجیر لاش کے پاس سے ملی تھی۔ اس کا نام زار ان ہے... زار ان عام طور پر ہوٹل ڈوبے میں دیکھا جاتا ہے... اس اطلاع پھر ہم وہاں گئے تھے، اور پھنس گئے... ڈوبے ہوٹل اسی بلیک میلر کا ہے... جو داراب خان کو بلیک میل کر رہا ہے... لیکن وہ صرف اسی کو نہیں اور نہ جانے کتنوں کو بلیک میل کر چکا ہے...“

”یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے داراب خان شمشیر کو کس بنیاد پر بلیک میل کیا ہے۔“

”داراب خان اس سوال کا جواب نہیں دے رہا ہے... اور ظاہر ہے... وہ جواب کیسے دے سکتا ہے... اسی راز کو چھپانے کے لیے تو اس نے اپنی ساری دولت بلیک میلر کو دے دی... کیا نام بتایا تھا اس نے ہوٹل کے مالک کا۔“ انسپٹر جمشید بات کرتے کرتے رک گئے۔“

”کک... کس نے۔“ فاروق ہکلا یا۔

”ہوٹل کے پیرے نے...“

”اوہ ہاں! اس نے ہوٹل کے مالک کا نام قائم خان بتایا

تھا۔“

”مطلب یہ کہ ہمارے اس بار کے مجرم کا نام قائم خان ہے... اب الجھن رہ گئی داراب خان کے بھائی کی... اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا... جولاش ملی تھی... زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ اسی کی تھی... اور اس کا مطلب ہے... داراب خان کا بھائی سرخاب خان مارا جا چکا ہے... اور وہی سرخاب بھی تھا... تو کیا وہ جرائم پیشہ تھا... اور قائم خان نے اسے زارن کے ذریعے قتل کرا دیا تھا... سوال یہ ہے کہ کیوں... ایک اور سوال یہ ہے کہ داراب خان کا بھائی جو گم ہو گیا تھا... اچانک جرائم پیشہ کیسے بن گیا... یہ اس کیس کے چند اہم سوالات ہیں... جن کے جوابات ہمیں معلوم ہو جائیں تو کیس حل ہو جائے گا... رہ جائے گا... قائم خان... اسے بھی انشا اللہ تلاش کر لیں گے... کیونکہ اس نے ہمیں اپنی ذاتی جیل کی سیر کرائی ہے ہمیں اسے سرکاری جیل کی ہوا کھلائیں گے۔“ انسپکٹر جمشید کہتے چلے گئے۔

”انشا اللہ۔“

”تو پھر اب ہوٹل کے ملازمین سے باری باری ملاقات کرنی چاہیے اگر اہم سب سے پہلے زارن خان کو لے آؤ۔“

”جی اچھا! اگر اہم نے کہا اور اپنے ماتحت کو ہدایات دیں...“

جلد ہی زارن خان اندر داخل ہوا۔“ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا...“

”ہاں تو مسٹر زارن جان... آپ ہوٹل ڈوبے کے نائب منیجر ہیں... یہی بات ہے نا۔“

”جی جناب۔“

”اور آپ ہوٹل کے مالک کو جانتے ہیں۔“

”جی جناب!“

”اس کا حلیہ بتائیں۔“

”وہ ایک درمیانے قد کے سڈول جسم کے مالک ہیں... رنگ سرخ و سفید ہے... آنکھیں نیلی چوڑی پیشانی... چہرہ لمبوتر، ناک لمبی پتلی سی، اسی طرح ہونٹ بھی پتلی۔ نہ جانے کیوں ان کی طرف دیکھنے سے خوف کا احساس ہوتا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”آپ ہوٹل کی ملازمت سے پہلے کیا کرتے تھے اور یہ ملازمت کیسے ملی؟“

”میں ایک ماہر جیب کترا تھا... ہوٹل ڈوبے میں اکثر کھانا کھانے کے لیے جاتا تھا... بس وہیں ایک دن ہوٹل کے مالک نے مجھ سے ملاقات کی اور اس نے کام کرنے کی پیش کش کی... اس نے بتایا میں اکیلا وارداتیں کرتا ہوں... اس کے ساتھ مل کر کام کروں گا تو زیادہ آسانی ہوگی اور معاوضہ بھی بہت معقول ملے گا... میں تو پہلے ہی

”تب پھر اس کا اپنا حلیہ بھی تبدیل ہوگا... اور تم لوگ اسے جس حلیے میں دیکھتے رہے ہو، اس کا اصل حلیہ نہیں ہوگا۔“

”ہاں! یہی بات ہے۔“

”اب ایک بات اور... آخر اس نے اتنے لمبے چوڑے انتظامات کیسے کر لیے... یعنی ہوٹل کے کمرے میں ایک ایسا نظام... کہ کوئی اس کے کمرے کے فرش پر کھڑا ہو اور وہ بٹن دبا دے تو وہ بے چارہ نیچے بہت گہرائی میں جا گرے... پھر وہاں گدے بچائے گئے... نیچے باقاعدہ جیل بنائی گئی... تاکہ اغوا کرنے والے کو وہاں رکھا جاسکے، ان سے بڑی بڑی رقمیں وصول کی جاسکیں... اتنا کچھ اس نے کیسے کر لیا۔“

”یہ اس نے نہیں کیا تھا۔“ زوار جان نے جلدی سے کہا۔

”تب پھر؟“

”ہوٹل کسی اور نے بنوایا تھا... وہ خود کوئی بہت بڑا انجینئر تھا... یہ سب کام اس نے خفیہ طور پر اپنی نگرانی میں کرایا تھا... لیکن ہمارے پاس نے یہ ہوٹل کیسے لے لیا... یہ بات آج تک کسی کو معلوم نہیں ہو سکی۔“

”پاس کی رہائش کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔“

”جی نہیں... ہمیں تو وہ ہوٹل کے کمرے میں ہی بلاتا

جرائم پیشہ تھا... ہر وقت پکڑے جانے کا دھڑکا لگا رہتا تھا... ہوٹل کے مالک نے یہ بھی کہا کہ ساتھ مل کر کام کرنے میں پولیس سے حفاظت بھی ہے... بس اس طرح میں نے ان کے لیے کام کرنا شروع کر دیا۔“

”لیکن اسے یہ کس طرح پتا چل جاتا تھا کہ کون سا شخص جرائم پیشہ ہے۔“

”میرے ایک دوست کے ذریعے اسے میرے بارے میں پتا چلا... میرے ذریعے سے بھی اسے کئی لوگوں کے بارے میں معلوم ہوا... بس اس کا طریقہ کار یہی ہے... ظاہر ہے... پہلے وہ خود بھی اسی قسم کی وارداتیں کر رہا ہوگا... پھر اس نے اپنا گروہ بنانا شروع کر دیا... اب جو لوگ پہلے ہی اس کے واقف تھے... وہ اس کے گروہ میں شامل ہو گئے اور ان کے ذریعے اور لوگ شامل ہوتے چلے گئے... اس طرح اس نے گروہ ترتیب دے ڈالا... وہ میک اپ کا بہت بڑا ماہر ہے اس نے ہم سب کے حلیے تبدیل کر دیے۔“

”کیا یہ کام اس نے خود کیا۔“

”ہاں سب کے چہروں پر اس نے خود میک اپ کیا... مطلب یہ نہیں کہ ایک ہی بار ایسا کیا بلکہ جب بھی کسی کو گروپ میں شامل کرتا ہے، پہلے اس کا حلیہ تبدیل کرتا ہے... لہذا ہم سب کے حلیے بدلے ہوئے ہیں۔“

تھا... اس کمرے میں وہ کیسے آتا تھا اور کمرے سے کیسے نکلتا تھا... یہ پتا نہیں چل سکا۔۔۔“

”ادہ... اس کا مطلب تو پھر یہ ہے کہ اس کمرے سے باہر نکلنے کا اور باہر سے اس کمرے میں آنے کا کوئی خفیہ راستہ موجود ہے... ہمیں وہ راستہ معلوم کرنا ہوگا۔“ انسپکٹر کامران مرزا چونک کر بولے۔

”لیکن کیسے اکل... اس کمرے میں جانے کا مطلب ہے... نیچے جا کرنا۔“ آصف نے منہ بتایا۔

”کوئی پروا نہیں... نیچے گدے بچے ہیں... ہمیں کوئی چوٹ نہیں آئے گی... لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم ضرور نیچے جا کریں... ہم دیوار کے ساتھ ساتھ رہیں... خلا فرش کے درمیان میں ہوگا... دیوار کے ساتھ نہیں۔“

”بالکل ٹھیک... لیکن پہلے ہمیں یہاں اپنا کام مکمل کر لینا چاہیے۔“

”باس کے بارے میں یہ خاص بات معلوم ہوگئی ہے کہ وہ کسی خفیہ راستے سے کمرے میں آتا جاتا تھا... اس لیے اب یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ان لوگوں میں شامل نہیں۔ لہذا ان سے ہم بعد میں بات کر لیں گے فی الحال تو ہمیں ان معلومات سے فائدہ اٹھانا

”ہوں... ٹھیک ہے... آئیے پھر ہوٹل چلیں۔“ محمود نے پر جوش انداز میں کہا۔

”دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جائیں گے... ورنہ ہم نیچے جا کریں گے۔“ آصف نے خوش ہو کر کہا۔

اب ان سب پر ایک جوش کی حالت طاری ہوگئی... کیونکہ باس کا سراغ لگانے کی امید ہو چکی تھی... جب کہ اس سے پہلے وہ سوچتے رہے تھے کہ نہ جانے باس کی تلاش میں کیا کیا پاؤں بلیے پڑیں گے:

اور پھر وہ ہوٹل پہنچ گئے... ہوٹل سل کیا جا چکا تھا اور اس کے گرد پولیس کا پہرہ تھا۔ ان کے اشارے پر صدر دروازہ کھولا گیا... وہ لفٹ کے ذریعے اوپر پہنچ گئے۔

عین اس وقت فرزانہ نے ہلکی سی شی کی آواز منہ سے نکالی، ساتھ ہی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر انہیں خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔ ان سب نے حیران ہو کر فرزانہ کی طرف دیکھا، کیونکہ انہیں تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوا تھا:

اپنے کسی سامی کا انتظار بھی نہ کیا اور لفٹ کا چھت والا مین دبا دیا... فوراً ہی وہ چھت پر تھے... انہوں نے منڈیر کے ساتھ ساتھ دوڑ کر چکر لگانا شروع کیا... ان کی نظریں نیچے تھیں... گویا وہ ہوٹل کے چاروں طرف کا جائزہ لے رہے تھے تاکہ کوئی کھٹا نظر آئے تو اسے دیکھ لیں... لیکن کافی دیر گزرنے پر بھی کوئی کسی طرف سے کھٹا نظر نہ آیا... اس وقت تک باقی ساتھی بھی اوپر آ چکے تھے:

”کوئی کھٹا نظر نہیں آیا۔“ انہوں نے کہا۔

”اس کا مطلب ہے... فرزانہ کے کان بجے تھے۔“

قاروق نے منہ بتایا۔

”خیر یہ بات تو نہیں۔“ فرحت مسکرائی۔

”تم تو ظاہر ہے، اس کا ساتھ دو کی۔“

”یہ بات بھی نہیں... میں نے بھی ایک ہلکی سی آواز سنی لی تھی... لیکن فرزانہ مجھ سے پہلے بتا بیٹھی۔“

”شکر یہ فرحت... ورنہ یہ حضرت تو مجھے آڑے ہاتھوں لینے پر تلے ہیں۔“

”واہ! ایک ہی جملے میں دو محاورے۔“ آصف چکا۔

”بھئی پہلے باس کا کمرہ...“ انسپکٹر جمشید بولے۔

اور پھر وہ باس کے کمرے میں داخل ہوئے... دیوار

آخری آرام گاہ

ان کی نظریں فرزانہ پر جم گئیں... گویا وہ اس سے اشاروں میں پوچھنا چاہتے تھے... کیا بات ہے... اس نے کیا دیکھا یا سنا ہے... فرزانہ نے انہیں اشاروں میں بتایا کہ یہاں ان کے علاوہ کوئی اور بھی موجود ہے۔ اب تو وہ چوکے ہو گئے... انسپکٹر جمشید نے انہیں ادھر ادھر ستونوں وغیرہ کے پیچھے پوزیشن لینے کا اشارہ کیا... وہ فوراً حرکت میں آ گئے، لیکن انہوں نے ہلکی سی آہٹ بھی نہ ہونے دی:

چند منٹ تک وہ دم سادھے رہے... آخر فرزانہ نے ایک طویل سانس لی اور اوٹ سے نکل آئی، ساتھ ہی اس نے کہا:

”وہ چھ کوئی بھی تھا... باس کے کمرے میں تھا... لیکن اب

وہ جا چکا ہے... اور ظاہر ہے، وہ باس ہی تھا۔“

”کیا!!!“ انسپکٹر جمشید چلائے اور فوراً لفٹ کی طرف دوڑے... آن کی آن میں وہ لفٹ میں داخل ہو گئے... انہوں نے

”لیکن جمشید! اس کے لیے کیا طریقہ اختیار کر دے... مجھے تو دور دور تک کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا۔“

”اس کے لیے ہمیں عقل پر زور دینا ہوگا۔“

اور وہ سب سوچ میں گم ہو گئے۔ ”آخر آصف نے کہا:

”میرے خیال میں ہمیں وہ خفیہ راستہ تلاش کرنا ہوگا... کیا

خبر وہ راستہ آس پاس کی کسی عمارت میں جاتا ہو۔“

”کیا!!!“ وہ ایک ساتھ چلا اٹھے۔

اب تو ان پر جوش طاری ہو گیا:

”بہت خوب آصف... تم نے بہت کام کی بات

مائی... اس بات کا زبردست امکان ہے... اور اس کے لیے آسان

ترین بات بھی یہی تھی کہ یہاں سے نکلنے والا خفیہ راستہ کسی آس پاس

عمارت تک جاتا ہو... واضح رہے کہ یہ ہوٹل اور اس کا نیچے والا نظام

ایک ماہر انجینئر نے بنوایا تھا... اور وہی اس جگہ کا اس ہو سکتا ہے...

چلو پھر پہلے راستہ تلاش کریں۔ انہوں نے دیواروں کے ساتھ ساتھ

رہ کر کمرے کے ایک ایک انچ کا جائزہ لیا... ایسے میں پروفیسر

صاحب بولے:

”یار جمشید... میں تو تھک گیا... باس کی کرسی پر بیٹھ

جاؤں۔“

سے لگ کر اندر آتے چلے گئے... اس وقت انہوں نے دیکھا... کرسی کے پاس جوتوں کے تازہ نشان موجود تھے... نشانات کیلے تھے... یہ بات محسوس کر کے انسپکٹر کامران مرزا کمرے کے غسل خانے کی طرف بڑھے اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئے... انہوں نے قفل چلنے کی ہلکی سی آواز محسوس کی:

”اس میں شک نہیں رہا کہ وہ یہاں موجود تھا... اور غسل

خانے میں بھی آیا تھا... اسی لیے کرسی کے پاس جوتوں کے نشانات

کیلے ہیں... اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہم نے عملے کے جو لوگ

گرفتار کیے ہیں، وہ ان میں شامل نہیں... بلکہ آزاد گھوم پھر رہا ہے

اور اپنے بچاؤ میں لگا ہوا ہے... ظاہر ہے... اب وہ خوف محسوس

کرنے لگا ہوگا... اور یہاں سے کوئی چیز لے جانے کے لیے آیا ہوگا

... یا پھر انگلیوں کے نشانات مٹانے کے لیے۔“

”جی ہاں اکل... یہی بات ہو سکتی ہے... خیر... اب

اگر ہم ہوٹل سے نکلنے کا راستہ تلاش کر لیتے ہیں... تو بھی کوئی فائدہ

نہیں ہوگا... کیونکہ وہ تو اب یہاں ہی نہیں۔“

”بالکل ٹھیک... ہم اس کام میں وقت کیوں ضائع کریں

... فرض کریں ہم وہ راستہ تلاش کر لیتے ہیں... تو اسے گرفتار تو کر

نہیں لیں گے... ہمیں تو اس کا سراغ لگانا ہوگا۔“

بسم اللہ پڑھ کر پہلے ایک بٹن دبایا... فرش میں فوراً ہی چوکر غلامودار ہوا... انہوں نے دوسرا بٹن دبایا تو خلا پڑ ہو گیا...
 ”لو بھی... یہ تو معلوم ہو گیا... کہ اس بٹن کو دبانے سے یہ غلامودار ہوتا ہے... اب میں اللہ کا نام لے کر تیسرا بٹن دبانے لگا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“

اب انہوں نے تیسرا بٹن دبایا... فوراً ہی اس کرسی کے نیچے ایک غلامودار ہوا اور نیچے سیڑھیاں جاتی نظر آئیں:
 ”وہ مارا جمشید۔“

”لیجیے! آپ تو ہمارے ابا جان کو مارنے لگے۔“ فاروق نے منہ بتایا۔

”من نہیں... نہیں میرا مطلب ہے... کرسی کے نیچے سیڑھیاں نظر آ گئی ہیں۔“

”بس تو پھر یہی وہ راستہ ہے... جس کے ذریعے وہ اس کمرے میں آتا جاتا ہے...“

”تو کیوں نہ چوتھا بٹن دبا کر دیکھ لیا جائے۔“
 ”ہاں! پہلے ان بٹنوں کو دیکھ لیتے ہیں، نیچے بعد میں چلیں گے۔“

”جی ضرور... اس میں کوئی خطرہ نہیں... کیونکہ باس جب دوسروں کو نیچے گراتا تھا... تو اس وقت وہ کرسی پر بیٹھا ہوتا تھا...“
 ”بہت بہت شکریہ جمشید...“ پروفیسر داؤد نے خوش ہو کر کہا اور کرسی پر بیٹھ گئے۔

ادھر وہ اپنے کام میں مشغول ہو گئے... پروفیسر داؤد بھی باس کی کرسی کا جائزہ لینے لگے... ایسے میں انہوں نے چونک کر کہا:

”اس کرسی میں چند بٹن لگے ہوئے ہیں... ان میں سے ایک کے دبانے سے تو شاید اس فرش میں غلامودار ہوتا ہوگا... اور دوسرے چند بٹن دبانے سے کیا ہوتا ہے... یہ ہمیں معلوم نہیں... لہذا کیوں نہ پہلے ان بٹنوں کا تجربہ کر لیا جائے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”تم سب باہر نکل جاؤ... میں باری باری بٹن دبا کر دیکھتا ہوں... ظاہر ہے، کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص کو تو کوئی نقصان ان بٹنوں کے دبنے سے پہنچے گا نہیں۔“

”آپ کی بات بالکل ٹھیک ہے اور ایسا کر کے دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔“

اب وہ سب کمرے سے نکل آئے... پروفیسر داؤد نے

یہ کہہ کر انسپکٹر کا مران مرزا نیچے اترنے لگے... ان کے پیچھے چھوٹی پارٹی چل پڑی۔ پھر خان رحمان اور ان کے بعد پروفیسر داؤد... ان کے پیچھے انسپکٹر جمشید سیڑھیاں اترنے لگے۔ انسپکٹر کا مران مرزا نے پستول ہاتھ میں لے لیا تھا... کیونکہ مجرم کچھ دیر پہلے اس کمرے میں موجود تھا... اور کسی بھی وقت اس سے سامنا ہو سکتا تھا... سیڑھیاں ختم ہونے پر انہوں نے خود کو ایک مستطیل کمرے میں پایا... یہاں بے حد ٹھنڈک تھی... شاید یہ تہہ خانہ ٹھنڈک کے لیے ہی بنایا گیا تھا... یا پھر اس گروہ کا باس یہاں آرام کر لیتا ہوگا... اب انہوں نے اس کمرے کو غور سے دیکھا... تہ خانے کے فرش پر ایک موٹا قالین بچھایا گیا تھا... خان رحمان نے قالین الٹ دیا۔ ایسے میں فرزانہ نے کہا:

”نہیں اکل۔“

”نہیں اکل کیا... میں تو ہاں اکل ہوں۔“ خان رحمان نے منہ بتایا۔

”میرا مطلب ہے... اب تہ خانے میں کوئی راستہ تو نکلنے سے رہا، ہاں دیواروں میں کوئی راستہ نکلنے کا امکان ہے۔“

”ہوں... واقعی۔“

انہوں نے دیوار کا معائنہ کیا... ایک جگہ ایک گڑھا سا

انہوں نے چوتھا بٹن دبایا تو سیڑھیاں غائب ہو گئیں...
خلا پڑ ہو گیا:

”یہ تو صرف بند کرنے کا بٹن ہے... گویا دو بٹن خلا نمودار کرنے کے ہیں اور دو تہہ خانے کے... اور پانچواں بٹن یہاں کوئی ہے نہیں۔“

”ٹھیک ہے... آپ تیسرے بٹن کو دبا دیں... تاکہ ہم ان سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اتر چلیں اور دیکھیں کہ یہ راستہ کہاں ختم ہوتا ہے... اور وہاں ہمارا مجرم موجود ہے یا نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“

سیڑھیاں دوبارہ نمودار ہو گئیں... وہ بس اتنی چوڑائی میں تھیں کہ ایک آدمی آسانی سے اتر سکتا تھا... سیڑھیاں نمودار ہونے کے ساتھ ہی نیچے ایک بلب بھی جل اٹھا تھا... اور وہاں اندھیرا نہیں تھا:

”تو کیا سب سے آگے میں چلوں جمشید۔“ خان رحمان بولے۔

”نہیں! آپ نہیں... سب سے آگے انسپکٹر کا مران مرزا جائیں گے اور سب سے آخر میں میں... درمیان میں باقی لوگ۔“

”بس تو پھر میں بسم اللہ پڑھتا ہوں۔“

نظر آیا۔ اس میں انگلی ڈال کر جو دبایا گیا تو کھٹ کی آواز کے ساتھ ایک دروازہ کھل گیا اور انہیں ایک سرگ نظر آئی۔۔۔ اس میں ایک آدمی ایک وقت میں چل سکتا تھا:

”ہوشیار... خبردار...“ انسپکٹر کامران مرزا نے سرسراتی آواز منہ سے نکالی۔

”ہاں! اگر وہ سرگ کے دوسری طرف ہوا تو ہمیں نشانہ بنا سکتا ہے، اور ہم اس پر قائل نہیں کر سکیں گے... کیونکہ وہ پوزیشن سنبھالے ہوئے ہوگا۔“

”واقعی... یہ خطرناک ہے... اللہ اپنا رحم فرمائے۔“

”لیکن ہم رک نہیں سکتے... آگے تو ہمیں بڑھنا ہوگا۔“

انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری۔

”بالکل ٹھیک۔“ انسپکٹر کامران مرزا نے کہا اور سرگ میں داخل ہو گئے... باقی لوگ ان کے پیچھے پیچھے چلے۔

”مم... میں... میں۔“ فرحت ہکلائی۔

”تم میں کسی بکری کی روح تو داخل نہیں ہوگئی۔“

”نن... نہیں... میرا مطلب ہے... شاید ہم پھنس گئے ہیں۔“

”شاید نہیں یقیناً۔“ انسپکٹر جمشید بھرپور انداز میں بولے۔

”جی کیا مطلب... آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”فرحت اور فرزانہ نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ کوئی اس کمرے میں تھا اور ہمارے آنے کے بعد ہی یہاں سے وہ نکلا ہے... گویا اندر ہی اندر کہیں غائب ہو گیا ہے... اس کے بعد جب ہمیں آسانی سے تہ خانے کا راستہ مل گیا... تو پہلا خیال مجھے اور انسپکٹر کامران مرزا کو یہی آیا تھا کہ مجرم ہمیں پھانسنے کا منصوبہ بنا چکا ہے۔“

”کیا مطلب... یہ آپ نے کیا کہا... آپ دونوں نے یہ بات جان لی تھی... آپ اپنے بارے میں تو خیر یہ بات کہہ سکتے ہیں... لیکن انکل کے بارے میں یہ کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”ہم دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر اپنا اپنا خیال آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو بتا دیا تھا... تم لوگوں پر یہ بات اس لیے ظاہر نہیں کی تھی کہ خوف زدہ نہ ہو جاؤ۔“

”آپ... آپ کا مطلب ہے... ہم پھنس چکے ہیں۔“

”ہاں بالکل۔“

”لیکن کیوں... ہم تو آسانی سے واپس جاسکتے ہیں... واپسی کا راستہ تو کھلا ہے۔“

”چلو... تم لوگ یہ بھی کر کے دیکھ لو۔“

”یہی بات ہے... اور اس کا مطلب ہے... ہمارے لیے آگے بھی موت ہے۔“

”اللہ اپنا رحم کرے... خیر... اس گیس سے بچنے کے لیے ہمیں سرنگ میں آگے تو جانا پڑے گا... ورنہ ہم یہیں دم گھٹ کر مرجائیں گے... جب کہ ہمیں معلوم نہیں، ہمارے لیے آگے کیا سامان تیار ہے۔“

وہ سرنگ میں چلنے لگے... زبرد کے بلب روشن تھے... ان کی روشنی میں قدم اٹھانا مشکل کام نہیں تھا... سرنگ کے آخر میں ان کے سامنے ایک دروازہ تھا... انہوں نے اسے دھکیلا تو دروازہ کھل گیا... وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئے، اگرچہ جانتے تھے... یہ کمرہ ان کے لیے خیرہ ثابت ہو سکتا تھا... ادھر وہ اندر داخل ہوئے... ادھر دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا... ساتھ ہی انہوں نے باس کی آواز سنی:

”میں جانتا تھا... تم لوگ یہاں آؤ گے... اس لیے میں نے پہلے ہی تمہاری دعوت کا انتظام کر لیا تھا... اب اس کمرے میں آرام کرو... جب تک چاہے رہو... مجھے کوئی اعتراض نہیں... یہ تمہاری آخری آرام گاہ ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس کی آواز بند ہو گئی... اور کمرے

”کیا ہم واقعی یہ کر کے دیکھ لیں۔“

”ہاں بالکل۔“ انسپکٹر کا مران مرزا مسکرائے۔

آصف اور محمود تیزی سے واپس مڑ گئے اور وہاں سے ہو کر آخری سیڑھی پر پہنچے... انہوں نے تہ خانے کا دروازہ ادھر سے بند نہیں کیا تھا... کھلا رہنے دیا تھا، لیکن اب بند تھا۔ انہوں نے اس کا ہنڈل پکڑ کر کھینچا... لیکن دروازہ نہ کھلا... اس کا مطلب یہ تھا کہ مجرم اپنے کمرے کی طرف سے دروازہ بند کر چکا تھا... اور ایسا اسی صورت میں ممکن تھا... جب وہ پھر چکر لگا کر اپنے کمرے میں آ گیا ہو... یعنی اس وقت جب یہ لوگ نیچے اتر گئے تھے:

”آپ کا خیال ٹھیک ہے اکل۔“

”تب پھر میرا ایک خیال اور ہے۔“

”اور وہ کیا اکل۔“

”ہم تہ خانے سے ہو کر سرنگ میں داخل ہونے پر مجبور

ہیں۔“

”وہ کیوں۔“

”اس نے اپنے کمرے کی طرف سے گیس چھوڑنا شروع

کر دی ہے۔“

”کیا!!!“ وہ ایک ساتھ زور سے بولے۔

میں گھپ اندھیرا ہو گیا:

☆☆☆☆☆

ذاتی معاملہ

”یہ.... یہ کیا بھائی باس... آپ نے تو کمرے میں گھپ اندھیرا کر دیا... اب ہم ایک دوسرے کو کیسے دیکھیں گے... کم از کم آدھ بلب تو جلا رہے دیتے... اب اس گھپ اندھیرے میں تو ٹوئیاں ہی مار سکیں گے... دیے اگر تم ہم سے ٹاک ٹوئیاں ہی چاہتے ہو تو اور بات ہے... مجبوری ہے پھر تو...“ فاروق جلدی کہتا چلا گیا۔

”یار کیا ٹاک ٹوئیاں ٹاک ٹوئیاں لگا رکھی ہے۔ کوئی اور لفظ نہیں سو جھڑپا کیا۔“ آفتاب نے جھلا کر کہا۔

”اس اندھیرے میں بے چارے القاط کی دال گل بھی کیسے سکتی ہے۔“ محمود ہنسا۔

”گگ... کیا کیا کہا... القاط کی دال۔“ آفتاب نے جلدی سے کہا۔

”ہاں! لیکن یہ کسی ناول کا نام نہیں ہو سکتا۔“ فاروق کی

مایوسانہ آواز ابھری۔

”نہیں ہو سکتا تو نہ ہو سکے... جائے بھاڑ میں... سوال تو یہ ہے کہ ہم اس کمرے سے نکلنے کی کوشش تو کر ہی سکتے ہیں۔“ خان رحمان کی آواز ابھری۔

”شش شکر یہ خان رحمان۔“ پروفیسر داؤد بولے۔

”یہ آپ نے شکر یہ کس بات کا ادا کیا ہے... پروفیسر صاحب۔“

”اس بات کا کہ اعدائے میں بھی تم کمرے سے نکلنے کی بات کر رہے ہو۔“

”آپ فکر نہ کریں... ہم سر دھڑکی بازی لگا دیں گے۔“

”لیکن اکل! آپ بھول رہے ہیں... بیاس نے کہا

ہے... یہ ہماری آخری آرام گاہ ہے۔“

”اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے... ہم اپنی کوشش کریں

گے... وہ اپنی کرتار ہے... محمود تم اپنا چاقو نکالو۔“

”اس کے مقابلے میں چاقو تو پہلے ہی ناکام ہو چکا ہے۔“

”وہ اس جیل کا معاملہ تھا... یہ دروازہ لوہے کا ہو گا یا لکڑی

کا... لہذا محمود کا چاقو کام کرے گا۔“

”اچھی بات ہے۔“ محمود کی آواز سنائی دی... پھر اس نے

کہا:

”یہ لیں چاقو۔“

اب وہ دروازے پر چاقو آزمانے لگے... باقی لوگوں کو انہوں نے دروازے کے پاس سے ہٹا دیا تھا... کیونکہ اعدائے میں چاقو ادھر ادھر ہو سکتا تھا... باقی لوگ بھی بیکار نہیں بیٹھے تھے... وہ کمرے کو ٹٹولنے لگے... دیواروں اور فرش کا جائزہ لینے لگے... آخر انسپکٹر جمشید کی آواز ابھری:

”وہ مارا... میں دروازے میں سوراخ کرنے میں کامیاب ہو چکا ہوں... اللہ نے چاہا تو ہم جلد کمرے سے باہر ہوں گے۔“

”انشاء اللہ!“

”اور اباجان... میں نے فرش میں ایک خلا بھی تلاش کیا ہے... اس خلا میں ایک ہک موجود ہے... کیا خیال ہے... اسے اوپر اٹھا کر یا نیچے دبا کر دیکھوں۔“

”ابھی نہیں فرزانہ... کہیں ہم سب پھر نیچے نہ جا گریں... ہمارا مقابلہ اس مرتبہ ایک بہت زبردست انجینئر اور میک اپ کے ماہر سے ہے... اس نے اس سارے معاملے میں میک اپ کی مہارت سے بھی کام لیا اور انجینئرنگ سے بھی۔“

”اچھی بات ہے... پہلے آپ اپنی کوشش کر لیں۔“

اس نے یہ کیا کہ ہمیں یہاں قید کر گیا... اس کا خیال تھا کہ ہم یہاں بھوکے پیاسے مرجائیں گے... لیکن اس کا یہ وار بھی خالی گیا اور ظاہر ہے... اب وہ اس مکان کا رخ نہیں کرے گا... ہوٹل بھی نہیں جائے گا... لیکن اس سے ایک بار پھر غلطی ہو گئی ہے... اور اب وہ بچ نہیں سکتا۔“

”آپ کا اشارہ کس غلطی کی طرف ہے۔“

”وہ ہم سے باتیں کرتا رہا ہے... پہلے بھی باتیں کر چکا ہے... آواز بدل کر بات کرتے کرتے وہ کبھی کبھی اپنی اصل آواز کی طرف لوٹ جاتا ہے... مکمل طور پر تو نہیں... کسی حد تک... اب اگر وہ اپنے اصل روپ میں اصل آواز کے ساتھ مجھ سے بات کرے گا تو میں سمجھ جاؤں گا کہ وہی ہے۔“

”لیکن پہلے تو ہمیں اس تک پہنچنا پڑے گا... جب کہ ہم ابھی تک نہیں جانتے کہ وہ کون ہے۔“

”بھئی اندازے تو آدمی لگا ہی لیتا ہے... پور میں نے ایک اندازہ بہر حال لگا لیا ہے.. انپکٹر کا مران مرزا بھی یہ انداز لگا چکے ہیں... اور میرا خیال ہے... اب اس سے ملاقات کر ہی لیں۔“

”ارے باپ رے... تو آپ جان گئے ہیں... وہ کون ہے۔“

انپکٹر جمشید پھر دروازے پر جٹ گئے۔ آخر ان کی آواز ایک بار پھر سنائی دی:

”دروازہ کھل گیا ہے... اور اب میں شاید اس عمارت کے برآمدے میں ہوں، لیکن یہاں بھی اتنا ہی اندھیرا ہے۔“

”اوہ...“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

”لیکن بہر حال... یہاں سوئچ بورڈ ہوگا اور ہم اسے تلاش کر ہی سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“

اب وہ لگے سوئچ بورڈ کی تلاش میں دیواروں پر ہاتھ پھیرنے... آخر بورڈ مل گیا... ہٹن دباتے ہی روشنی ہو گئی:

”اللہ کا شکر ہے... روشنی تو ہوئی۔“ پروفیسر داؤد نے خوش ہو کر کہا۔

انہوں نے دیکھا... وہ ایک برآمدے میں تھے جس کمرے سے نکل کر وہ آئے تھے... انہوں نے اس میں بھی بلب روشن کر دیا تھا... اپنے سامنے کھڑکی دیکھ کر وہ اس کی طرف بڑھے... کھڑکی کھولی تو ہوٹل ڈوبے کا پچھلا حصہ نظر آیا:

”بہت خوب! بات واضح ہو گئی... وہ یہاں سے نکل کر ڈوبے چلا جاتا ہے اور وہاں سے نکل کر یہاں آ جاتا تھا... آخری وار

درجے پر اسرار ہو گیا ہے۔“
 ”آپ کا اشارہ اس بلیک میلر کی طرف ہے؟“ اس نے
 سوالیہ انداز میں کہا۔
 ”ہاں بالکل۔۔۔“
 ”آئیے۔“

وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے آیا:
 ”آپ کب سے گھر میں ہیں۔“
 ”میں تو آج کہیں گیا ہی نہیں۔“
 انسپکٹر جمشید نے خفیہ فورس کے انچارج کو فون کیا اور
 بولے:

”داراب خان شمشیر کے بارے میں کیا رپورٹ ہے۔“
 ”یہ شخص صبح سے گھر ہی میں ہے۔“
 ”کیا خبر ان کے گھر کا کوئی خفیہ راستہ ہو اور اس راستے سے
 نکل کر کہیں گئے ہوں۔“

”جی نہیں۔۔۔ یہ ایک کرائے کا مکان ہے۔۔۔ کرائے پر
 رہنے کے لیے ہی بنوایا گیا ہے۔۔۔ داراب خان سے پہلے بھی یہاں
 کرائے دار ہی رہتے تھے۔۔۔ لہذا اس مکان کا کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے
 ۔۔۔ یہ صبح سے کہیں نہیں گئے۔۔۔ اس میں کوئی شک دالی بات نہیں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔۔۔ آؤ چلیں۔“
 وہ مکان سے نکل کر ہوٹل کی طرف آئے۔۔۔ ماتحت عملے
 کو اس مکان کے بارے میں ہدایات دے کر وہ اپنی گاڑی میں روانہ
 ہوئے۔۔۔ جلد ہی وہ داراب خان شمشیر کے دروازے پر رے کے۔۔۔
 ”ارے باپ رے۔۔۔ تو یہی ہے۔۔۔ ہمارا اس بار کا
 مجرم۔“ محمود نے حیران ہو کر کہا۔

”چھپا رستم کہو۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔
 محمود نے آگے بڑھ کر دستک دی۔۔۔ دروازہ فوراً ہی
 کھلا اور داراب خان کی صورت نظر آئی۔۔۔ ساتھ ہی ان سب کو وہاں
 دیکھ کر اس کے چہرے پر حیرت دوڑ گئی:

”خیر تو ہے۔۔۔ آپ لوگ پھر آ گئے۔“ اس نے کہا۔
 اس کی آواز سن کر انسپکٹر جمشید اور انسپکٹر کامران مرزا
 چونک اٹھے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر دونوں
 کے منہ سے ایک ساتھ نکلا:

”یہ کیا؟“
 ”کیا مطلب۔۔۔ کیا معاملہ ہے۔“ داراب خان کے لہجے
 میں حیرت ہی حیرت تھی۔

”ہم آپ سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔۔۔ معاملہ اب حد

”اچھی بات ہے... ہم اس پر یقین کے لیے... لیکن یہ یقین کرنا ہمارے لیے اس وقت بہت مشکل کام ہے۔“

”جی کیا مطلب...“ نمبر ایک چونکا۔

”ہمارے اندازوں کی عمارت ڈھیر ہو گئی ہے... تمام اندازے غلط ثابت ہو گئے ہیں... اور اس کیس کا مجرم ہمارے لیے اب تک ایک معرہ بنا ہوا ہے۔“

”اللہ رحم کرے... آپ تو ایسا نہ کہیں... اگر مجرم نے کہیں آپ کے یہ الفاظ سن لیے تو پھول کر کپا ہو جائے گا۔“

”یہی تو میں چاہتا ہوں۔“ انسپکٹر جمشید ہنسے۔

”جی... کیا مطلب؟“

”جب وہ پھول کر کپا ہو جائے گا تو پھر غلطی کرے گا... اور اس کی غلطیاں ہمارے کام آئیں گی... لیکن یہ تو بعد کی بات ہے... اللہ نے چاہا تو ہم بہت جلد اسے پکڑ لیں گے... اچھا شکریہ۔“

فون بند کر کے وہ اس کی طرف مڑے:

”آپ کو سرخا کی لاش دکھائی گئی تھی؟“

”جی ہاں! لیکن وہ میرے بھائی کی نہیں تھی... وہ تو جرائم پیشہ سرخا کی تھی۔“

”اگر آپ ہمیں یہ بتادیں کہ بلیک میلر آپ کو کس بنیاد پر بلیک میل کرتا رہا ہے تو ہمارا کام آسان ہو جائے گا۔“

”میں نے بلیک میلر سے ایک غلط کام کرایا تھا... بس اسی بنیاد پر اس نے مجھے بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔“

”وہ غلط کام کیا تھا... مہربانی کر کے بتادیں... ہم آپ کو اس جرم میں گرفتار نہیں کریں گے... یہ میرا وعدہ ہے۔“

”وہ میرا ذاتی معاملہ تھا... اس معاملے کا تعلق جرم سے نہیں بنتا... اخلاقی تھا... بلکہ آپ یوں سمجھ لیں گھر کا مسئلہ تھا... لیکن اگر وہ مسئلہ اخبارات میں آ جاتا تو میں کہیں کا نہ رہتا۔“

”کہیں کے تو آپ اب بھی نہیں رہے... سب کچھ تو گنوا بیٹھے ہیں۔“

”دولت گنوا بیٹھا ہوں... لیکن گھر کی عزت بچ گئی... اور اب چونکہ میرے پاس اسے دینے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا، اس لیے اب اس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا ہے۔“

”خیر... ہم بھی آپ کو آپ کے حال پر چھوڑتے ہیں... ہم اپنے مجرم کو کسی اور طریقے سے پکڑیں گے۔ اب ہم چلتے ہیں۔“

وہ اس کے گھر سے نکل کر اپنے گھر آئے... بیگم جمشید کا پارہ بہت گرم تھا۔ چھوٹے ہی بولیں:

”پتا بھی ہے... کتنی بار کھانا گرم کر چکی ہوں۔“

”بالکل پتا نہیں بیگم... آپ بتا دیں۔“ انہوں نے فوراً

کہا۔

ان کا منہ اور بن گیا... کھانے کے بعد وہ لائبریری میں چلے آئے... ایک بار پھر سرخا کے قتل والی تصویر نکالی اور لگے اسے غور سے دیکھنے:

”اب بہت زیادہ غور سے دیکھنے پر میں یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اس کے چہرے پر میک اپ کیا گیا ہے... اور اس شخص کی شکل اگر میک اپ کے بغیر دیکھی جائے تو یہ ضرور دراب خان کا بھائی سرخاب خان ہے...“

”ادھ ان کے منہ سے نکلا۔“

”اور ہم اس کے ڈرائنگ روم میں لگی سرخاب خان کی تصویر اس تصویر سے ملا کی دیکھنے جا رہے ہیں... لیکن ہمیں وہ تصویر کرائے کے گھر میں نظر نہیں آئی... حویلی میں ہم ضرور دیکھ چکے ہیں... ایک منٹ... میں فون کر کے پوچھ لیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر انہوں نے دراب خان کے نمبر ملایا۔ اس کی آواز سن کر انہوں نے کہا:

”حویلی کے ڈرائنگ روم میں... آپ کے بھائی کی جو

تصویر ملی ہوئی تھی... وہ کہاں ہے؟“

”وہ میں لے آیا تھا... لیکن ابھی تک ڈرائنگ روم میں

لگانے کا موقع نہیں ملا۔“

”ہم وہ تصویر ایک بار پھر دیکھنا چاہتے ہیں۔“

”تشریف لے آئیں۔“ اس نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

”آپ کو شاید یہ بات سن کر حیرت ہوئی ہے۔“

”ہاں... یہی بات ہے...“

انہوں نے وہ اخبارات ساتھ لے لیے... اور ایک بار پھر وہاں پہنچ گئے... داراب خان کے چہرے پر حیرت ہی حیرت تھی:

”آخر یہ ہو کیا رہا ہے... آپ لوگ میرے پیچھے ہاتھ دھو کر

ہی پڑ گئے ہیں۔“

”بس! ایک آدھ دن میں... بلکہ شاید آج ہی یہ کیس ختم ہونے والا ہے... ہم معافی چاہتے ہیں... آپ کو واقعی بہت تکلیف دے رہے ہیں۔“

”خیر فرمائیں! اب کس لیے آنا پڑا ہے آپ کو۔“

”بس وہ تصویر دکھا دیں۔“

”جی اچھا۔“

یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا... جلد ہی اس کی داپسی

ہوئی... اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں:

”کیا بات ہے۔ خیر تو ہے۔“

”وہ... وہ تصویر غائب ہے۔“

”کیا مطلب... غائب ہے۔“

”ہاں! کوئی اسے لے اڑا۔“

”حیرت ہے... کمال ہے... آخر کوئی کیسے اس تصویر کو

آپ کے مکان سے لے اڑا...“

”شاید وہ اس گھر کا بھیدی تھا۔“

”ہوں... خیر... ہم آپ کو یہ تصویر پہلے بھی دکھا چکے

ہیں... اب ذرا اسے ایک بار پھر غور سے دیکھیں۔“ یہ کہہ کر انہوں

نے اخبار والی تصویر اس کے سامنے رکھ دی۔

اس نے اس پر نظر ڈالتے ہی کہا:

”یہ سرخا کی لاش ہے۔“

”بالکل ٹھیک... لیکن ہماری درخواست ہے کہ آپ اسے

غور سے دیکھیں۔“

”آخر اس کی کیا ضرورت ہے۔“

”بس... ضرورت ہے... آپ دیکھیں اسے غور سے۔“

آخر اس نے تصویر پر نظریں جمادیں... کافی دیر تک

غور سے دیکھنے کے بعد آخر اس نے کہا:

”یہ سرخا کی ہی لاش ہے... کیونکہ جب میں نے پولیس کو

بتایا تھا کہ یہ میرے بھائی کی لاش کی تصویر نہیں ہے... تب پولیس نے

خود یہ کہا تھا کہ تب پھر یہ سرخا ہی کی لاش ہے... جو مشہور جرائم پیشہ

تھا۔“ اس نے پورے اعتماد سے بتایا۔

”ہوں... خیر... مطلب یہ کہ یہ تصویر آپ کو ہر لحاظ سے

سرخا کی لگتی ہے... اور کسی بھی لحاظ سے اپنے بھائی کی نہیں۔“

”جی نہیں۔“ اس نے کہا۔

”لیکن!“ انسپکٹر جمشید نے عجیب سے انداز میں کہا۔

”لیکن کیا۔“

”یہ تصویر سرخا کی نہیں... آپ کے بھائی کی ہے۔“

”کیا!!! وہ چلا اٹھا۔“

☆☆☆☆☆

”یہی بات ہے۔“

”آخر آپ یہ بات کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”اس گروہ کے طریقہ کار پر غور کرنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں... گروہ کا سرغنہ لوگوں کو بلیک میل کرتا ہے... سوال یہ ہے کہ کیسے اور اس سوال کا جواب یہ ہے کہ بلیک میل کو پہلے ہی معلوم ہوتا ہے کہ کس نے اس کی خدمات حاصل کی ہیں، لہذا اس بنیاد پر وہ اسے بلیک میل کرنا شروع کر دیتا ہے کہ وہ پولیس کو ثبوت فراہم کر دے گا۔ کہ تم نے اپنے فلاں رشتے دار کو قتل کروایا ہے...“

”اوہ اوہ۔“ مارے خوف کے ایک بار پھر اس کے منہ سے

نکلا۔

”لہذا اب میں ایک بات یقین سے کہہ سکتا ہوں۔“

”اور وہ کیا۔“

”بلیک میل نے جو آپ کو کوڑی کوڑی کا محتاج کر ڈالا... تو

اس بنیاد پر کہ آپ نے اس کے ذریعے اپنے بھائی کو قتل کروایا تھا... یہ

بات اسی کو معلوم تھی... لہذا اسی بات پر آپ کو بلیک میل کیا۔“

”نن نہیں... یہ غلط ہے۔“

”اگر یہ غلط ہے تو پھر آپ کو بتایا ہوگا کہ وہ آپ کو کس بنیاد پر

بلیک میل کرتا رہا ہے۔“

قاتل

چند لمحے تک وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تصویر کو دیکھتا

رہا... آخر بولا:

”آپ کا مطلب یہ... اس روز جرائم پیشہ سرخا

نہیں... میرا بھائی مارا گیا تھا۔“

”ہاں! آپ کے بھائی کو ایک جرائم پیشہ گروہ نے ہلاک کیا

تھا۔

”لیکن کیوں۔“ وہ چلا اٹھا۔

”اس گروہ کا کام ہی یہی تھا... وہ ایک طرح سے کرائے

کے قاتل تھے... شہر میں کوئی شخص کسی کو قتل کرانا چاہتا تو ان کی مدد لیتا

تھا... اس طرح کسی نے اس گروہ کے ذریعے آپ کے بھائی کو قتل کر

وادیا۔“

”نن نہیں... نہیں... یہ غلط ہے۔“ اس نے خوف کے عالم

میں کہا۔

ضرورت ہے۔ خیر میں اقرار کرتا ہوں... میں نے ہی اس یہ میلر کے ذریعے اپنے بھائی سرخاب خان شمشیر کو قتل کرایا تھا۔“
 ”ارے باپ رے۔“ کئی آوازیں ابھریں۔

”اب آپ آئے سیدھے راستے پر... بس اب صرف یہ بتا دیں کہ آپ کا اس بلیک میلر سے رابطہ کیسے ہوا تھا۔“

”ان دنوں اخبارات میں ایک اشتہار شائع ہوتا تھا اور بہت باقاعدگی سے شائع ہوتا تھا... اشتہار کے الفاظ یہ ہوتے تھے... کیا آپ کسی وجہ سے پریشان ہیں، کسی شخص کی طرف سے پریشان ہیں... ہم آپ کی پریشانی لمحوں میں ختم کر سکتے ہیں... آزمائش شرط ہے... آزمائش کی کوئی شرط نہیں... ان الفاظ کے نیچے لکھا ہوتا تھا۔ روحانی علاج گاہ... 110 گارڈن کالونی، فون نمبر بھی لکھا ہوتا تھا... میں نے سوچا... اپنی پریشانی ان کے ذریعے حل کر والوں... میں نے نوٹ کیا... تو ادھر سے کسی پروفیسر عرفانی نے بات کی... میں نے اس سے کہا کہ میں اپنی ایک پریشانی کے سلسلہ میں بات کرنا چاہتا ہوں۔“ بس اس نے مجھے ملاقات کا وقت دے دیا، میں ان سے ملا... اپنی پریشانی بتائی... انہوں نے بس پریشانی کے حل کی فیس دس لاکھ بتائی... میں نے پوچھا آپ کریں گے کیا... انہوں نے بتایا... بس آپ کے بھائی کو غائب کر دیا جائے

”نن نہیں... نہیں... میں یہ بات نہیں بتا سکتا۔“ وہ چیخا۔
 ”اس لیے کہ... اس طرح آپ قانون کے شکنجے میں آجائیں گے...“ انسپکٹر جمشید مسکرا دیے۔

”آپ... آپ نے بالکل غلط نتیجہ نکالا ہے۔“

”تب پھر جو درست بات ہے، آپ وہ بتادیں۔“

”میں نہیں بتا سکتا۔“

”اس صورت میں ہم آپ کو گرفتار کر رہے ہیں... کمرہ امتحان میں جب آپ کو شکنجے میں کس دیا جائے گا... اس وقت آپ وہاں فر فر بتائیں گے...“ یہ کہہ کر انہوں نے اکرام کے نمبر ملایا... اور وہ اس کی آوازیں کر بولے۔

”اکرام... دراب خان شمشیر کے کرائے کے مکان پر آجاؤ... اسے کمرہ امتحان میں لے جانا ہے۔“

”نن نہیں... نہیں۔“ دراب خان پوری قوت سے چلایا۔

”بھئی اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے...“ خان رحمان نے منہ بتایا۔

”حد ہوگئی... آپ مجھے قتل کا مجرم ثابت کرنے پر تلے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں، اس میں اس قدر پریشان ہونے کی کیا

گا... سو میں جال میں پھنس گیا... میں نے دس لاکھ تو دے دیے۔
لیکن اس کے بعد چابی گویا ان کے ہاتھ میں دے دی... بس میرے
بھائی غائب ہو گئے... چند دن بعد اس لاش کی تصویر شائع
ہوئی... میں نے اپنا پچاؤ کرنے کے لیے تھانے میں رپورٹ درج
کرادی تھی... لہذا لاش ملنے پر تھانے دار نے مجھے بلا لیا... لاش مجھے
دکھائی گئی، میں نے بتایا کہ وہ لاش میرے بھائی کی نہیں ہے... اور
اس کے بعد مجھے بلیک میل کرنا شروع کر دیا... یہ ہے کہانی: یہاں تک
کہہ کہ وہ خاموش ہو گیا...“

”لیکن انہوں نے پولیس کو کیا چیزیں بھیجنے کی بات کی تھی...
جس کی بنا پر آپ خوف زدہ ہو گئے۔“
”میرے بھائی کے قتل کا منظر تھا... اور قتل کرنے والا بھی
بالکل میری شکل صورت کا تھا۔“

”میں نہیں جانتا... وہ تصاویر انہوں نے کیسے تیار کر لی
تھیں... اور وہ دن اور آج کا دن... اس نے رقیں اینٹھ اینٹھ کر مجھے
کنگال کر دیا۔“

”ہوں! وہ تصاویر دکھا سکتے ہیں آپ۔“

”جی نہیں... اس کے بارے میں اس نے ہدایات دی تھیں
کہ ان کو جلا دیا جائے، سو میں نے ان تصاویر کو جلا دیا تھا۔“

”ہوں... کیا آپ پھر کبھی اس طرف گئے... وہ دفتر اب
بھی وہاں ہے یا نہیں۔“

”مجھے معلوم نہیں... اس نے یہ بھی کہا تھا... اس دفتر کا رخ
نہ کروں اور نہ کسی سے اس معاملے کا ذکر کروں... ورنہ یہ تصاویر
پولیس کو بھیجوانا کون سا مشکل کام ہے۔“

”ہوں... اچھا... ہم چیک کر لیتے ہیں۔“

انہوں نے پروفیسر عرفانی کے نمبر پر فون کیا، دوسری
طرف سے فوراً کہا گیا:

”پروفیسر عرفانی بات کر رہا ہوں... فرمائیے۔“

انہیں یہ الفاظ سن کر حیرت ہوئی... کیونکہ ان کا خیال
تھا کہ اب وہ دفتر موجود نہیں ہوگا اور نہ اس نمبر پر کوئی بات کرے
گا... انہوں نے آواز بدل کر کہا:

”مجھے ایک بہت بڑی پریشانی نے آلیا ہے... کیا آپ
میری مدد کر سکتے ہیں۔“

”جی نہیں... ان دنوں دفتر بند ہے... آپ ایک ماہ بعد
فون کریں۔“ ان الفاظ کے ساتھ ہی فون بند کر دیا گیا۔

”گویا موجودہ حالات میں انہوں نے دفتر بند کر دیا
ہے... لیکن انہیں پھر بھی امید ہے کہ ہم ان کا سراغ نہیں لگا سکیں گے

”اب کیا کیا جائے۔“

”اس دفتر کے آس پاس کے لوگوں سے سوالات کیے جائیں۔۔۔ شاید ان میں سے کوئی ایسی بات بتا دے جس سے ہمیں پروفیسر عرفانی تک پہنچنے میں مدد مل جائے۔“ انسپکٹر جمشید نے مشورہ دیا۔

اب وہ پروفیسر عرفانی کے دفتر پہنچے۔۔۔ انہوں نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھ گچھ شروع کی۔۔۔ آخر ایک سگریٹ فروش نے بتایا۔

”عرفانی صاحب! ایک غیر ملکی کمپنی کے سگریٹ کے بہت زیادہ شوقین ہیں۔۔۔ ان اطراف میں چونکہ وہ سگریٹ نہیں ملتے، اس لیے مجھے ان کے لیے ایک بڑی مارکیٹ سے وہ سگریٹ خرید کر لانا پڑتے ہیں۔۔۔ چند دن پہلے انہوں نے بتایا تھا کہ ان کے پاس سگریٹ ختم ہو گئے ہیں، اس لیے میں نے ان کے لیے منگوا لیے۔۔۔ اور وہ کسی کو بھیج کر منگوائیں گے۔۔۔“

”بہت خوب! دیکھیے۔۔۔ ہمارا تعلق پولیس سے ہے۔“

”جی۔۔۔ کیا مطلب؟ وہ گھبرا گیا۔

”آپ کو گھبرانے اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ نے قانون کی مدد کی تو قانون بھی آپ کی مدد کرے گا۔۔۔ ہمیں

اور وہ اپنا کام دوبارہ شروع کر سکیں گے۔۔۔ خیر ہمیں تو اس دفتر کا تو جائزہ لینا ہوگا۔“

انہوں نے دراب خان کو اکرام کے حوالے کیا اور خود اس پتے پر پہنچ گئے۔۔۔ دفتر کو تالا لگایا ہوا تھا۔۔۔ آس پاس والوں سے پوچھا تو ایک دکان دار نے بتایا:

”پروفیسر عرفانی ایک ہفتے سے غائب ہیں۔“

اب انہوں نے تالا کھولا اور اندر داخل ہو گئے۔ اگلیوں کے نشانات اٹھائے گئے، وہ نشانات فوراً اکرام کو دیے گئے اس نے اپنے ریکارڈ سے ملائے اور پھر انہیں بتایا:

”یہ نشانات ایک بہت پرانے بلیک میلر فوزی کے ہیں۔۔۔“

”اور فوزی سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”یہ دیکھنا ہوگا۔۔۔ میں آپ کو چند منٹ بعد بتا سکوں گا۔“

”اچھا اکرام۔“

چند منٹ بعد اکرام کا موصول ہوا:

”سر: گیارہ سال پہلے وہ جیل سے رہا ہوا تھا۔۔۔ اس کے بعد

سے لاپتا ہے۔“

”ہوں۔۔۔ گویا ہم ایک بار پھر مجرم کا سراغ کھو بیٹھے

ہیں۔۔۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔۔۔ اور بولے۔

گے... آپ بھی نکل کھڑے ہوں۔“
 ”اچھی بات ہے اکرام... بہت احتیاط سے تعاقب کرنا... ایک گاڑی اس سے آگے اور ایک گاڑی پیچھے رہے گی اور اسے تعاقب کا شک نہ ہونے پائے۔“
 ”آپ فکر نہ کریں سر۔“

پھر وہ گھر سے نکل آئے اور اکرام سے رابطہ کرتے ہوئے آخر وہاں تک پہنچ گئے جہاں وہ تھا... وہ گاڑی ایک کوشی کے سامنے رک گئی... وہ کافی قاصطے پر رک گئے... یہاں تک کہ کار کے لیے دروازہ کھولا گیا... کار اندر چلی گئی... اور دروازہ بند کر لیا گیا، پھر وہ منٹ بعد وہ آگے بڑھے، اکرام نے اپنے ماتحتوں کو ہدایات شروع کر دیں... پھر وہ کار سے اتر کر دروازے پر آ گئے... انہوں نے دیکھا دروازے پر بہادر علی خان ایڈووکیٹ کی تختی تھی، انسپکٹر جمشید کے اشارے پر محمود نے گھنٹی کا بٹن دبا دیا:

”کیا ہم مجرم سے ملاقات کرنے والے ہیں۔“ آصف بڑبڑایا۔

”ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا... تاہم ہم مجرم کے ایک ساتھی تک ضرور پہنچ گئے ہیں... پروفیسر عرفانی یا تو خود باس ہے یا باس کا ساتھی...“

اس شخص سے کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے... اس سلسلے میں تو آپ ہماری مدد کریں گے۔“

”جی... ضرور کیوں نہیں سر۔“
 ”اچھا تو پھر یوں کریں... ہم یہاں سے کچھ دوڑ کھڑے ہو جاتے ہیں... جب وہ آئے تو آپ سر کی طرف ہاتھ لے جا کر اشارہ کر دیں... ہم سمجھ جائیں گے۔“
 ”جی اچھا!“

اور وہ وہاں سے ہٹ آئے... ایسے میں آصف نے برا سامنہ بنا کر کہا:

”اب نہ جانے وہ صاحب کب تشریف لائیں۔“
 ”ہاں: یہ بات بھی ہے... تو پھر اکرام اور اس کے ماتحتوں کے ذریعے یہ کام لے لیتے ہیں اور ہم گھر چلے جاتے ہیں، جو نی ان کی طرف سے رپورٹ ملے گی... ہم چل پڑیں گے۔“
 ”یہ ٹھیک رہے گا۔“

اب انہوں نے اکرام کو وہاں بلا لیا... ساری بات اسے سمجھائی پھر سگریٹ والے کا سامنا اس سے کرا کے وہ چلے آئے... چار گھنٹے بعد اکرام کا فون ملا... وہ کہہ رہا تھا۔
 ”وہ آگیا ہے سر... اب ہم اس کا تعاقب کریں

”اور یہ بہادر علی خان۔“ آفتاب نے انگلی سے اشارہ کیا۔
 ”یہ بھی ان کا ساتھی ہو سکتا ہے... آخر کیس وغیرہ کے سلسلے
 میں انہیں وکیل کی بھی تو ضرورت پیش ہوتی ہوگی۔“
 ”ہوں...“

اتنے میں دروازہ کھلا اور اسی شخص کی شکل نظر آئی جو اس
 کار میں آیا تھا... معاف کیجیے گا... ہمیں بہادر علی خان سے ملنا ہے۔“
 ”میں انہیں بتاتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ گیٹ بند کرنے
 لگا... لیکن انسپکٹر کامران مرزا نے پاؤں آگے کر دیا۔
 ”یہ کیا کیا آپ نے۔“

”ہم آپ کے ساتھ ہی اندر چل رہے ہیں۔“
 ”لیکن یہ ملاقات کا کون سا طریقہ ہے۔“ اس نے بھنا کر
 کہا۔

”طریقہ نمبر 13... ویسے آپ کا نام کیا ہے۔“
 ”میرا ہی نام بہادر علی خان ہے اور میں ایک وکیل
 ہوں... آپ لوگوں کو غیر قانونی طور پر اپنے گھر میں داخل ہونے پر
 گرفتار کر سکتا ہوں۔“

”ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔“ قاروق مسکرایا۔
 ”یہی چاہتے ہیں... کیا چاہتے ہیں۔“

”یہ کہ آپ ہمیں گرفتار کروادیں... ہم کوئی اعتراض نہیں
 کریں گے۔“

”آپ لوگ عجیب ہیں۔“
 ”ہم صرف عجیب ہی نہیں... غریب بھی ہیں۔“ آفتاب
 نے فوراً کہا۔

اس وقت انسپکٹر کامران مرزا اندر داخل ہو گئے:
 ”آپ اپنے پاؤں پر کلبھاڑی مار رہے ہیں۔ وہ چلا اٹھا، شاید
 اس کا مقصد یہ تھا کہ اندر بیٹھے لوگ باخبر ہوں... لیکن انہوں نے کوئی
 پروا نہ کی... کیونکہ کہ باہر اکرام کے ماتحت موجود تھے۔
 ”کیا بات ہے بہادر علی خان۔“ کسی نے اندر سے
 کہا۔

یہ آواز سن کر ان کے دل دھڑک اٹھے... کیونکہ یہ
 آواز باس کی آواز تھی... اور وہ یہ آواز سنتے رہے تھے:
 ”باہر کچھ لوگ ہیں... وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں... اور بلا
 اجازت اندر گھس آئے ہیں... میں اس پر احتجاج کر رہا ہوں۔“
 ”میں آ رہا ہوں... دیکھتا ہوں... کون لوگ ہیں۔“
 اور پھر اندرونی دروازہ کھلا... ایک شخص باہر
 کلا... پھر جونہی اس کی نظر ان پر پڑی... وہ بہت زور سے

اچھلا... اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ نکلی:

☆☆☆☆☆

سرخ

انہوں نے دیکھا... اس کا چہرہ ان کے لیے اجنبی تھا،
لیکن وہ اسی شخص کی آواز باس کی آواز کے طور پر سنتے رہے تھے:
”خبردار!“ انسپکٹر کامران مرزا نے پستول سے اسے زد پر
لے لیا۔ اس کی آنکھوں میں اور خوف دوڑ گیا اس کے ہاتھ اور پاؤں
اٹھ گئے۔“ اس وقت مارے حیرت کے بہادر علی خان کے منہ سے
نکلا۔

”کیا مطلب... یہ سب کیا ہے۔“

”مطلب تو ہم بعد میں بتائیں گے... پہلے تو آپ یہ
بتائیں کہ آپ کا ان صاحب سے کیا تعلق ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے طنزیہ
لہجے میں کہا۔

”یہ... یہ میرے دوست ہیں... میرے ہاں یہاں ٹھہرے
ہوئے ہیں... ویسے اسی شہر میں رہتے ہیں۔“ بہادر علی خان نے جلدی
جلدی کہا۔

پروفیسر عرفانی جو روحانی علاج کے اشتہارات اخبارات میں شائع کر رہے ہیں... اور خاص قسم کی سگریٹ پیتے ہیں... اب اس وقت عرفانی صاحب کے ساتھ جو شخص ہے... کیا یہ ہوٹل ڈوبے کے مالک نہیں... جنہیں ہوٹل کے ملازمین باس کہتے ہیں۔“

”پتا نہیں آپ کیا کر رہے ہیں اور کہاں کی ہانک رہے ہیں۔“

”وہ ہم آپ کو بتادیں گے۔“ محمود نے برا سامانہ بتایا۔

”ہم بتادیں گے... کیا بتادیں گے... بھئی وضاحت بھی تو کرونا۔“ آصف نے اسے گھورا۔

”بھی کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور کہاں کی ہانک رہے ہیں... آپ دونوں کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”کہاں چلنا ہے۔“ دونوں ایک ساتھ بولے۔

”پولیس اسٹیشن اور کہاں؟“

”ہمارا جرم۔“

”بلیک میلنگ... قتل، جس بے جا میں رکھنا، ہوٹل ڈوبے کے نیچے ذاتی جیل میں لوگوں کو قید کرنا، ان سے بڑی بڑی رقمیں اینٹھنا۔“

”خوب خوب! تو یہ سب باتیں آپ ثابت کریں گے۔“

”اور اس وقت کہاں گئے تھے۔“

”مم... میں... میں سگریٹ لینے گیا تھا۔“

”سگریٹ لینے کے لیے بھلا کوئی اتنی دور بھی جاتا ہے۔“

”یہ... میرے دوست خاص قسم کی سگریٹ پیتے ہیں... اور یہ سگریٹ خاص خاص جگہوں سے ملتے ہیں... اس لیے مجھے اتنی دور سے لانے پڑے۔“

”لیکن سگریٹ والے نے تو ان کا نام پروفیسر عرفانی بتایا ہے۔“ فرزانہ بول اٹھی۔

”نن... نہیں... نہیں۔“ وہ بری طرح چلا اٹھا۔

”بہت خوب! یہ ہوئی ثابت تو آپ دونوں ساتھی ہیں... اور ہمیں چکر دینے کو شش کر رہے تھے... خیر... اب سن لو... تم لوگوں کے دن گئے جا چکے... خود کو قانون کے حوالے کر دو۔“

”پتا نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ بہادر علی خان بولے۔

”ہم نے کہا ہے... آپ دونوں خود کو قانون کے حوالے کر دیں۔“

”لیکن کیوں... آخر ہم نے کیا کیا ہے۔“

”ابھی تو آپ پروفیسر عرفانی کے نام سے چوٹے ہیں... وہ

”ہاں: اور نہیں تو کیا... محمود فاروق تم اس مکان کی تلاشی لے لو... اور ہاں ہمیں اگلیوں کے نشانات بھی اٹھانا ہیں... یہاں ملنے والے نشانات اگر ڈوبے ہوئے کمرے سے مل گئے تو ہمارے لیے مفید ہوں گے۔“

”آپ فکر نہ کریں... ہم نشانات بھی ساتھ ساتھ اٹھالیں گے۔“ آخر دوست ہیں۔“

چھوٹی پارٹی نے اندر کا رخ کیا تو انسپکٹر جمشید نے ان سے کہا:

”اب تم صرف یہ بتا دو... باس کہاں ہے۔“

”کون سا باس... پتا نہیں آپ کیا باتیں کر رہے ہیں۔“

”مطلب یہ کہ دونوں آسانی سے زبان نہیں کھلو گے۔“

”آپ جو کچھ پوچھ رہے ہیں... وہ ہمارے بس سے باہر

ہے۔“

”کیا تمہارا نام پروفیسر عرفانی نہیں... جس کا دفتر 110

گارڈن کالونی میں ہے۔“

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔“

”تب ہم تمہیں تمہارے دفتر لے چلتے ہیں... اگر وہاں آس

پاس کے لوگوں نے تمہیں پروفیسر عرفانی کے طور پر پہچان لیا تو

ٹھیک... ورنہ ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا۔

چھوٹی پارٹی کو وہیں چھوڑ کر وہ انہیں گارڈن کالونی والے دفتر تک لے آئے... انہیں آس پاس کے لوگوں کے سامنے کیا گیا اور ان سے پوچھا:

”یہ پروفیسر عرفانی ہیں نا۔“

ہر ایک نے ایک ہی جواب دیا۔

”جی نہیں... یہ پروفیسر عرفانی نہیں ہیں۔“

اب تو مارے حیرت کے ان کا برا حال ہو گیا... ایسے

میں بہادر علی خان نے طنز یہ لہجہ میں کہا:

”اب آپ کیا کہتے ہیں۔“

”واقعی ہم سے بہت بڑی غلطی ہوئی... آپ جاسکتے

ہیں... بلکہ آپ لوگ گاڑی میں بیٹھیں... ہم آپ کو وہیں چھوڑ کر

آئیں گے... ابھی ہمارے ساتھی بھی تو دعی پر ہیں... انہیں بھی تو

وہاں سے لینا ہے... آئیں چلیں۔“

وہ ان دونوں کو واپس وہیں لے آئے... گھر کے اندر

داخل ہوئے تو چھوٹی پارٹی بت بنی بیٹھی نظر آئی... یہ دیکھ کر وہ سب

مسکرائے... انسپکٹر جمشید نے ان سے پوچھا:

”تم لوگوں کو کیا ہوا بھی۔“

”اس عمارت میں کچھ نہیں ہے... اگلیوں کے نشانات بھی صرف ان دونوں کے ہی ہیں... البتہ...“ آصف یہاں تک کہہ کر رک گیا۔

”البتہ کے بعد کچھ کہنا منع ہے کیا۔“ محمود نے اسے گھورا۔
”نہیں تو... میں تو بس یہ دیکھنے کے لیے رک گیا تھا کہ تم صبر کرتے ہو یا نہیں۔“ آصف نے ہنس کر کہا۔

”حد ہوگئی... ہے کوئی تک... اصل بات بتا دو۔“

”البتہ... اندر کھانے کی میز پر ہمیں چائے کے تین کپ رکھے ملے ہیں... جبکہ یہاں رہنے والے دو ہیں... تینوں کپ ہمیں ہلکے سے گرم بھی لگے تھے... رہتے ہیں دو آدمی... غالباً ہمارے آنے سے پہلے وہ چائے پی رہے تھے... سوال یہ ہے کہ تیسرے کپ میں چائے کون پی رہا تھا۔“

”اچھی بات دریافت کی... ابھی ان سے پوچھ لیتے ہیں۔“ انسپکٹر جمشید نے پر جوش انداز میں کہا، پھر وہ ان کی طرف مڑے اور خوش گوار لہجے میں بولے:

”تم دونوں نے ہمارے پیارے بچوں کا خوب صورت اور حسین سوال تو سن ہی لیا ہوگا... اب ذرا اس کا جواب بھی دے دو...“

اگرچہ ہم جانتے ہیں، جواب بہت بھونڈا ہوگا۔“

”ایک پڑوسی آگئے تھے۔“ بہادر علی خان نے بڑا سادہ

بتایا۔

”یہ ہے شان دار جواب... محمود... اسے ساتھ لے جاؤ... بلکہ آصف تم بھی ساتھ جاؤ... ان کے ان پڑوسی کو لے آؤ... جنہوں نے خوش قسمتی سے ان ساتھ چائے پینے کا شرف حاصل کیا ہے۔“

”بھئی واہ... اس نے بیٹھے بٹھائے شرف حاصل کر لیا... اور ہم منہ دیکھتے رہ گئے۔ خیر... تم ان کے ساتھ جاؤ... اور پڑوسی کو لے آؤ۔“

”آؤ بھئی چلیں۔“ محمود نے جلدی سے کہا۔

بہادر علی خان اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں... اس پر خان

رحمان نے اس کے سینے پر ایک ہاتھ راکھ کر بولے:

”جاتے کیوں نہیں۔“

”وہ... وہ... وہ۔“

”تین بار وہ کہنے کی بجائے تین وہ کہہ دیتے۔“ آفتاب

نے منہ بتایا۔

”وہ کوئی پڑوسی نہیں تھا... ایسے ہی کوئی شخص چلا آیا تھا...“

یعنی بھولا بھٹکا... کسی کا گھر پوچھ رہا تھا... بس ہم نے اسے بھی چائے کی دعوت دے ڈالی۔“

”اچھا کیا... بلکہ بہت اچھا کیا... ایسا ہی کرنا چاہیے... آپ لوگ واقعی بہت نیک ہیں... لو بھئی تیسرے کپ کا مسئلہ تو حل ہو گیا... اب کوئی اور بات کرو۔“

”جی ہاں! ایک بات اور بھی ہے۔“ فرزانہ مسکرائی۔

”اوہ... لیکن دیکھو فرزانہ ایک اور بات تیسرے کپ جیسی نہ ہو... ورنہ یہ پھر کسی آتے جاتے کو اندر آنے کی دعوت دے بیٹھیں گے۔“

”جی نہیں... وہ ایسی بات نہیں ہے۔“

”چلو پھر تو تم بتا سکتی ہو...“

”امیر ایک کمرے کے فرش پر ایک جوتا موجود ہے... دوسرے پیر کا جوتا موجود نہیں۔“

”ہائیں... یہ کیا بات ہوئی... اس گھر میں جو دونوں حضرات نظر آ رہے ہیں... ان دونوں کے پیروں میں تو دو دو جوتے ہیں... وہ جوتا بھی اگر ان میں سے کسی کا ہے... تو اس کا دوسرا بھی ہونا چاہیے... وہ جوتا تو جادو کا لگتا ہے... ذرا اٹھا کر لانا اسے۔“

”ارے باپ رے... آپ مجھ سے جادو کا جوتا منگنا

چاہتے ہیں...“ فرزانہ گھبرا گئی۔

”اوہو... خرید کر نہیں لانا...“ فرحت نے جھلا کر کہا۔

”اچھ... اچھا۔“ فرزانہ نے کہا اور اندر چلی گئی۔

”بے چارے اچھ چھا کے دو کلڑے کر دیے۔“ فاروق

بولتا۔

”کس قدر رحم دل ہے... الفاظ تک پر رحم کھا رہا ہے۔“

آفتاب نے خوش ہو کر کہا۔

”تم بھی کھا لو... روکا ہے کسی نے۔“ آفتاب نے اسے

گھورا۔

اسی وقت فرزانہ جوتا لے آئی:

”یہ آپ میں سے کس کا ہے۔“

”میرا!“ بہادر علی خان نے فوراً کہا۔

”اس کا دوسرا کہاں ہے...“

”ظاہر ہے... گھر ہی میں ہوگا...“

”خوب خوب! پہلے تو یہ پہن کر دکھائیں نا ذرا۔“ آفتاب

نے خوش ہو کر کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے... آپ کس قسم کی باتیں کر رہے

ہیں... اب جوتا پہن کر دکھائیں انہیں۔“ بہادر علی خان نے جھلا کر

کہا۔

”مجبوری ہے... آپ کا کہنا ہے... یہ جوتا آپ کا ہے... تو پہن کر دکھانے میں کیا حرج ہے۔“

”لایئے... پہن کر دکھا دیتا ہوں۔“ اس نے جلتے کٹے انداز میں کہا اور پھر اپنا جوتا نکال کر وہ جوتا پہننے لگا... لیکن جوتا اس کے پاؤں میں نہ آسکا... وہ اس کے پاؤں سے کافی چھوٹا تھا۔

”لگتا ہے، آپ نے کافی چھوٹا جوتا خرید لیا... تاکہ دکان دار کو زیادہ پیسے بچ جائیں... یہی بات ہے نا... ہی ہی ہی۔“ آفتاب لگا پھٹنے۔

”لیکن کیا خبر یہ جوتا پروفیسر عرفانی صاحب کا ہو اور بہادر علی خان نے مروت میں کہہ دیا ہو کہ یہ ان کا ہے... پروفیسر صاحب ذرا یہ جوتا آپ پہن کر دکھائیں گے۔“

”نن نہیں... یہ میرا نہیں ہے۔“ وہ ہکلا یا۔

”تب تو پھر اس کا مطلب ہے... یہ اس شخص کا ہے... جس نے تیسرے کپ میں چائے پی تھی... اور جب ہم آئے تو اس نے غائب ہونے کی کوشش کی... اس کوشش میں اس کا ایک جوتا پاؤں سے نکل گیا... ایک جوتے کے ساتھ وہ گھر سے باہر تو نہیں جاسکتا... لہذا وہ گھر میں ہی کہیں ہے... چلو بھی... تم ذرا اس چپے رستم کو تلاش

کرو۔“

”جی اچھا!“ انہوں نے ایک ساتھ کہا۔
گھر میں ہر طرف دیکھنے کے بعد وہ وہیں لوٹ آئے... محمود نے کہا:

”جی... نہیں... کوئی چھپا رستم نہیں ملا۔“
”تب پھر اس کا مطلب صرف اور صرف ایک ہے... اور وہ یہ کہ اس مکان کے نیچے بھی ہوٹل کی طرح ایک تہہ خانہ موجود ہے... اور وہ ہمیں تلاش کرنا ہوگا۔“ انسپکٹر کا مران مرزا بولے۔
”اسے تلاش کرنے کا ایک سیدھا طریقہ بھی ہے ابا جان۔“
آفتاب مسکرایا۔

”بہت خوب! جلدی بتاؤ! وہ کیا طریقہ ہے۔“
”وہ سیدھا طریقہ یہ ہے۔“

یہ کہتے ہی آفتاب نے پستول جیب سے نکال لیا اور اس کی نال کار رخ پروفیسر عرفانی کی طرف کرتے ہوئے بولا:
”پروفیسر صاحب... اب یا تو آپ اس تہہ خانے کا راستہ بتائیں گے... یا پھر گولی کھائیں گے... دونوں باتوں میں سے آپ کو جو پسند ہو، وہ ہمیں بتادیں...“
”نن نہیں۔“ وہ چیخا۔

”نہیں کہنے سے مقصد حاصل نہیں ہوگا... آپ بس یہ بتائیں... تہہ خانے کا راستہ کس طرف ہے... اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں سنیں گے اور آپ کو دس تک گننے کی مہلت ہے... آفتاب! میں گنتی شروع کر رہا ہوں... اور تمہیں حکم دیتا ہوں... جونہی میرے منہ سے دس کا لفظ نکلے... تم فائر کر دینا اور ٹھیک دل کا نشانہ لینا۔ یہ بات ہم سب اچھی طرح جانتے ہیں کہ تمہارا نشانہ بہت ہی پختہ ہے۔“

”بہت بہتر!“

اور پھر انسپکٹر کا مران مرزا لگے گنتی گننے... ابھی آفتاب نے پانچ کہا تھا کہ وہ چلا اٹھا:

”ٹھہر جائیں... گنتی روک دیں... یہ آپ بہت زیادتی کر رہے ہیں... مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اس مکان کے نیچے کوئی تہہ خانہ ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا راستہ کس طرف ہے۔“

”راستہ تو ہم تلاش کر لیں گے... آپ صرف اتنا بتادیں کہ یہ جوتا کس کا ہے۔“

”جج... جوتا۔“ وہ ہکلا یا۔

”ہاں! اگر یہ آپ کا گھر ہے تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے... یہ جوتا کس کا ہے... یا آپ کے گھر میں کہاں سے آگیا... ہے بھی ایک... یا دونوں ہوتے... آپ کا اس بارے میں کیا جواب

ہے۔“ انسپکٹر جمشید نے سرد آواز میں کہا۔

جواب میں وہ خاموش رہا... آخر انسپکٹر کا مران مرزا نے کہا:

”ایسے کام نہیں چلے گا... یا آپ بتائیں گے یا ہم آپ کو شوٹ کریں گے اور یہ بات یاد رکھیں... تہہ خانے کا دروازہ ہم آخر کار تلاش کر لیں گے... آپ بلاوجہ جان سے جائیں گے۔“

”اچھی بات ہے... میں بتا دیتا ہوں... لیکن شرط ایک ہے۔“

”اور وہ کیا؟“

”آپ مجھے قانون کی گرفت سے بچائیں گے۔“

”میں یہ نہیں کر سکتا... کیونکہ نہیں جانتا... آپ کس حد تک مجرم ہیں، راستہ بتانا ہے تو بتائیں... ورنہ ہم آپ دونوں کو شوٹ کر رہے ہیں... آفتاب میں آگے گن رہا ہوں۔“ وہ غرائے۔

”ایک منٹ! میں بتاتا ہوں... جس کمرے میں جوتا ملا ہے... اس میں آتش دان کے اوپر لگے فریم کے نیچے راستہ کھلتا ہے... دائیں ہاتھ دیوار کے رنگ کا بٹن لگا ہے... وہ ابھرا ہوا نہیں ہے... بخوردیکھنے سے ہی نظر آ سکتا ہے۔“

”بہت خوب! چلو پھر اس کمرے میں۔“

... وہ خالی ہاتھ تھا... اور بے فکری کے عالم میں چلا آ رہا تھا... یہ دیکھ کر وہ مسکرا دیے، پھر انپکڑ جھید کی آواز گونج گئی:

”ہاتھ اوپر اٹھا دو چھپرے رستم!“

وہ بڑی طرح اچھلا... اور پھر اس کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے... آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔ انہوں نے دیکھا... اس شکل صورت کے شخص کو وہ پہلی بار دیکھ رہے تھے:

☆☆☆☆☆

PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اب وہ ان دونوں کو اس کمرے میں لے آئے... بٹن دبا ہی گیا۔ فوراً ہی آتش دان کے فریم کے پیچھے راستہ کھل گیا اور سیڑھیاں نیچے جاتی نظر آئیں:

”تم دونوں آگے چلو... اسے بتا دو... تم آرہے ہو... ورنہ وہ گولی چلا دے گا اور تم بے موت مارے جاؤ گے، جب کہ ہمارے خیال میں اصل مجرم تو وہ ہے... تم اس کے ساتھی ضرور ہو، اتنے مجرم نہیں جتنا کہ وہ ہے۔“

”ہوں ٹھیک ہے۔“

وہ دونوں سیڑھیاں اترنے لگے... ان کے پیچھے ہی وہ بھی چل پڑے... پستول انہوں نے ہاتھ میں لے لیے تھے... ایسے میں پروفیسر عرفانی نے کہا:

”باس! یہ ہم ہیں۔“

”تو وہ چلے گئے۔“

”ہاں باس!“ اس نے کہا۔

”بہت خوب! تب پھر میں خود اوپر آ جاتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے... آ جائیں۔“

وہ رک کر مڑے اور واپس اوپر آ گئے... ان سے پہلے ہی وہ پلٹ چکے تھے... جلد ہی انہوں نے باس کو باہر آتے دیکھا

”آپ کو کس بات پر حیرت ہے۔“
 ”جب میں نے ان لوگوں سے رابطہ کیا تھا کہ میں اپنے
 بھائی کو ہلاک کروانا چاہتا ہوں.... تو اسی شخص نے مجھ سے آکر
 ملاقات کی تھی۔“

”کیا!!!“ ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

چند سیکنڈ تک سب بات بنے اس کی طرف دیکھتے رہے
 پھر انسپکٹر جمشید نے کہا:

”تب پھر داراب خان... یہی اس گروہ کا سرغنہ ہے....
 یعنی یہی وہ بلیک میلر ہے.... جس نے تمہیں کوڑی کوڑی کو حجاج کر دیا
 ہے اور آخر آج تم سلاخوں کے پیچھے ہو۔“

”لیکن یہ کون ہے۔“

”ہوٹل ڈوبے کا مالک.... اس نے اس ہوٹل میں تمام ملازم
 جرائم پیشہ جمع کیے تھے.... ہوٹل کا کاروبار تو بس دکھاوا تھا.... اصل میں
 تو اس ہوٹل کے ذریعے یہ لوگوں کو بلیک میل کرتا تھا....“

اس کے بعد انہوں نے تمام تفصیلات سنا ڈالیں....
 آخر میں بولے:

”اس کی آواز اور ہنسنے کے انداز نے ہمیں تفتیش کے درست
 راستے پر ڈالا تھا.... یہ میک اپ اور پلاسٹک سرجری کا بہت بڑا ماہر

محرم

”کون ہو بھائی تم۔“ فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

”یہاں نہیں۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”جی کیا فرمایا آپ نے... یہ صاحب یہاں نہیں

ہیں... میرا مطلب ہے، ان کا نام ”یہاں نہیں“ ہے۔“

”یہ بات نہیں۔“

”تب پھر؟“

”اس کے بارے میں بات یہاں نہیں کریں گے.... دفتر

چل کر کریں گے.... وہاں آئی جی صاحب اور دوسرے افسران کو بھی بلا
 لیتے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ انسپکٹر کامران مرزا بولے۔

اور پھر وہ دفتر آگئے.... وہاں کئی آفیسر پہنچ چکے تھے۔

انسپکٹر جمشید کی ہدایات پر داراب خان کو بھی لایا گیا.... اس کے چہرے
 پر حیرت ہی حیرت تھی.... یہ بات محسوس کر کے انسپکٹر جمشید بولے:

”بھئی ساری بات جلدی سے بتادیں... مارے بے چینی کے میرا بڑا حال ہے۔“ آئی جی بولے۔

”مسٹر سرخا... آپ اپنا میک اپ خود ختم کریں گے یا میں یہ کام کروں۔“

”کیا کہا... سرخا... سرخا تو مارا گیا تھا...“ آئی جی صاحب چلائے۔

”جی نہیں... جو مارا گیا تھا... وہ کوئی اور تھا... اس کے چہرے پر سرخا کا میک اپ کیا گیا تھا۔“

”اوہ... اوہ... نہیں۔“ داراب خان نے بوکھلا کر کہا۔

”کیوں... کیا ہوا؟“

”وہ... وہ لاش سرخا کی نہیں... میرے بھائی کی تھی... جسے

میں نے اس بلیک میلر کے ذریعے قتل کرایا تھا... اس وقت میں نے

اسے اپنے بھائی کے طور پر پہچاننے سے جان بوجھ کر انکار کیا تھا...

تاکہ پولیس مجھے شک کی نظروں سے نہ دیکھے... اور اس پہلو سے

تفتیش شروع نہ کر دے کہ کہیں میں نے اپنے بھائی کو کرائے کے قاتل

سے قتل کرا دیا... اور ہوا بھی یہی... میں جان گیا تھا کہ میرا بھائی مارا

جا چکا ہے... اور یہی میں چاہتا تھا... تو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ یہ

میرے بھائی کی لاش ہے... اب ظاہر ہے... پولیس میرے بھائی کو

ہے... اس نے اپنے تمام ملازمین کے حلیے بدل دیے تھے... ظاہر ہے اپنا حلیہ بھی ضرور بدل ڈالا ہوگا... کیوں مسٹر باس... تم کچھ کہنا چاہو گے۔“

”ہاں! کیوں نہیں۔“ اس نے صاف اور سیدھی آواز میں کہا۔

اس کی آواز سن کر داراب خان ایک بار پھر زور سے اچھلا... مارے حیرت کے اس کی آنکھیں پھیل گئیں:

”کیوں داراب خان... کیا ہوا؟“ انسپکٹر جمشید نے۔

”یہ... یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں... یہ... یہ کیسے ہو سکتا

ہے۔“

”کیا کیسے ہو سکتا ہے؟“ آئی جی صاحب نے حیران ہو کر

پوچھا۔

”یہ کہ یہ شخص مجرم ہو... داراب خان دراصل یہ کہنا چاہتا

ہے... کیوں داراب خان؟“

”ہاں! یہی بات ہے۔“

”تو کیا داراب خان اس شخص کو پہچانتا ہے۔“

”ابھی ابھی آواز سن کر پہچانتا ہے اس نے...“ انسپکٹر جمشید

مسکرائے۔

کبھی تلاش نہیں کر سکتی تھی۔“

”ہوں... یہ سب تو ہوا... اب سوال یہ ہے کہ یہ بلیک میل کون ہے... کیا یہ شخص قانون کے لیے اجنبی ہے۔“ آئی جی بولے۔
 ”نہیں سر... ابھی ہم اس کا اصل چہرہ دیکھیں گے... چلو
 بھئی اپنا میک اپ خود ختم کرو... ورنہ ہم لوگ تو پھر تیزاب کے
 ذریعے اس کو ختم کر لیں گے۔“

”ٹھیک ہے... اب چھپا کر کروں گا بھی کیا۔“ اس نے کہا
 اور اپنا میک اپ ختم کرنے میں مصروف ہو گیا... سب حیرت زدہ
 انداز میں اسے ایسا کرتے دیکھ رہے تھے... کئی پتلی جھلیاں اور جلد
 کی رنگت کے کسی مادے کے ٹکڑے اس نے چہرے سے الگ کیے...
 اور پھر تو وہاں موجود بھی لوگ اچھلے تھے... سب سے زیادہ زور سے
 داراب خان اچھلا تھا... کیونکہ اس کی شکل سے بالکل ملتا جلتا ایک
 شخص ان کے سامنے موجود تھا:

”یہ... یہ... یہ کون ہے؟“ کئی آوازیں ابھریں۔

”سرخاب خان شمشیر... یعنی داراب خان کا بھائی... جسے
 اس نے قتل کرانے کے لیے اسی کی خدمات حاصل کیں... یہ خود ہی
 میک اپ میں اس سے آکر ملا... معاملہ طے کیا، رقم وصول کی... اور
 کسی لاش کے چہرے پر اپنا میک اپ کر دیا... یہ چونکہ سرخا کے نام

سے کئی وارداتیں کر چکا تھا... اس لیے اس کی لاش کو سرخا کی لاش
 خیال کیا گیا۔“

”لہلہ... لیکن جمشید... یہ کس طرح ممکن ہے... اس کا
 بھائی تو صرف دس سال پہلے غائب ہوا تھا... گویا دس سال پہلے یہ
 دونوں ملے جلتے تھے... اتنے عرصے میں یہ اتنا بڑا جرائم پیشہ کیسے بن
 گیا... اس نے ہوٹل کے نیچے تہہ خانہ تک ہواڈالا... وہاں جیل قائم
 کر لی... یہ بات تو حلق سے نہیں اتر رہی۔“

”اس کی وضاحت سرخاب خان خود کر دے تو اچھا ہے...
 کیونکہ ہم لوگ تو اندازوں کی بنیاد پر بات کرتے ہیں... چلو سرخاب
 خان اس بات کی بھی وضاحت کرو۔“ انسپکٹر جمشید نے کہا... آخر اس
 کے ہونٹ ہلے:

”میں کالج کے زمانے میں بڑی صحبت میں پڑ گیا تھا... پھر
 شہر کے ایک جرائم پیشہ شخص کی نظریں مجھ پر پڑ گئیں... اس نے مجھے
 اپنے گروہ میں شامل کر لیا... ہوٹل ڈوبے دراصل اس نے بنوایا تھا
 ... مجھے تو یہ سب اس کے مرنے کے بعد تیار شدہ ملا تھا:

”وہ اپنی موت آپ مرا تھا... یا تم نے اسے موت کے
 گھاٹ اتارا تھا تا کہ پورے گروہ کے سرغنہ بن جاؤ۔“
 ”یہی بات ہے... اور اس سے پہلے میں نے اس سے میک

”دھت تیرے کی... توبہ ہے تم سے۔“ محمود تملاکر بولا۔
اور سب مسکرانے لگے... مجرموں کے چہروں پر رات
کی تاریکی چھا چکی تھی۔

☆☆☆☆☆



A-38 ایٹرن اسٹوریز کھانہ، B-18 سائٹ کراچی
0300-2472238, 32578273, 34228050
e-mail: atlantis@cyber.net.pk
www.inspector-jamshed-series.com



PAKISTAN VIRTUAL LIBRARY
www.pdfbooksfree.pk

اپ کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ میک اپ کا بہت بڑا ماہر تھا... جب میں نے
اس سے یہ فن سیکھ لیا اور اس میں خوب ماہر ہو گیا تو اسے ٹھکانے لگا دیا
... اور پروفیسر عرفانی والے لاشتہارات کے ذریعے لوگوں سے دولت
حاصل کرنے لگا... اسی سلسلے میں داراب خان نے رابطہ کیا... وہ مجھے
ہلاک کرانا چاہتا تھا کہ میں اس سے نصف دولت کا مطالبہ نہ کروں...
اس کی غرض تو بس یہ تھی... میں نے سوچا... جس دولت کے لیے یہ
مجھے ہلاک کرانا چاہتا ہے... میں اسے اس دولت سے بالکل محروم کر
دوں گا... اور زندگی بھر یہ اس خوف میں مبتلا رہے گا کہ کہیں بھائی کے
قتل کے جرم میں پولیس اسے گرفتار نہ کر لے اور میں نے یہی
کیا... بس یہ ہے کل کہانی۔“

”کہانی تو واقعی ختم ہو گئی... اور بہت سبق آموز انداز میں
ختم ہوئی... یہ دولت ہے ہی ایسی چیز... حیرت تو اس بات پر ہے کہ
آخر لوگ اس دولت کے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے ہیں... یہاں
تک کہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں اور کیا اس سے یہ بہتر نہیں کہ ایسے
لوگ پانی سے ہاتھ دھولیا کریں۔“ فاروق نے بڑا سامنہ بنایا۔
”ہے کوئی تک اس بات کی۔“ آفتاب نے بھنا کر کہا۔
”اگر یہ بات تک کی نہیں... تو تم شروع کر دو تک کی بات
... ہم سب سننے کے لیے تیار ہیں۔“